

سادی

بہتا تنکا

سفید منزل سے آئے کے بعد ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا لگڑا ہو جو چہار کے پاٹ پاشی ہو جانے کے بعد طوفان میں بہتا ہوا ایک دیران ساحل پر آ لگا ہو۔

لاہور کی وہ بہماں گویا معدوم ہو چکی تھی۔ عمارتوں کا وہ پھیلا وہ سٹ کر بے معنی تھیر ڈھیر بن گیا تھا۔ نہیں طرف کے پھیکے نے آسمان نے تھیر لیا تھا سڑکوں پر دھول اڑتی تھی۔ مکانات لگڑا ہو رہے تھے جیسے دفتازندگی سے حرکت مفقود ہو گئی ہو اور چادر پر ایک ساکن تصویر رکھا ہو۔

سارا دن وہ نیم چھتی میں بیٹھ کر اونٹھا شام کو سوچتا کیا کروں کدھر جاؤں۔

اس کی اس تو اریجی واپسی کے بعد صرف ایک دن کے لیے ناؤ گھر میں ہنگامہ سا ہوا تھا۔ نہ جانے کیسے لیکن بھا جاہ اور پال کو اس رات کے ہنگامے کا علم ہو چکا تھا۔ ممکن ہے سجنی بخاری نے بات کہدی ہو یا خون بلغم کے لیب کے اس ڈاکٹرنے انہیں قصہ سنادیا ہو جو سفید منزل کے قریب ہی رہتا تھا۔ یا شاید بھانے ہنگامہ سن کر خو اکر تحقیق کی ہو رہا حال اس روز وہ تینوں دیر تک بیٹھے باقیں کرتے رہے تھے۔

بڑا ہنگامہ ہوا ”بھانے کہا سارے محلے والے جانتے ہیں“

”ہوں“ جاہ نے منہ بنا لیا

”جبھی کل رات ہم سے بغل کیر ہو رہا تھا“ پال بولا

”ہاں“ بھا بولا ”میں نے بھی کہا بارہ بیجے کوئی گاڑی جاتی ہے“

”مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ایلی چھپا رسم ہے“ جاہ نے کہا ”انسان کو سمجھنا کس قدر مشکل ہے۔ ایک طرف تو وہ پایا ب کنارہ اور دوسری طرف یہ عمق“ وہ فلسفیانہ انداز میں مسکرا لیا۔ اس کی مسکرا بہت میں تحقیر کی جھلک تھی۔

پال ہٹنے لگا ”بھی عشق و محبت کے دن ہیں“

”ہم پر تو نہ آئے یہ دن“ جاہ نے کہا ایک سے ذرا سی راہ و رسم ہوئی تھی۔ لیکن یا ریہ کام اپنے بس کا نہیں۔ کون سارا وقت ضائع کرے۔ وہ ہٹنے لگا

”لیکن کیا واقعی ہو جا رہے تھے؟“ پال نے پوچھا

”ہاں ہاں“ بھاٹے کہا

جیرت ہے ”جاہ بولا ایلی پر کوئی اس قدر مفتون ہو جائے کہ وہ ہٹنے لگا“ ہاں بھی کوئی ہم پر ہوتی تو بات بھی تھی اور پھر انصار منصر کا گھرانہ کوئی معمولی گھر انہیں۔“

انصار منصر ”پال نے پوچھا وہ کون ہے۔“

”امیر تو خیر نہیں مگر بزرگ مہدی رب متدن گھرانا ہے اور منصر کی قابلیت کا بڑا چہ چاہے اصلیت کا تو علم نہیں مجھے شاید واقعی قابل ہو۔ ویسے اونچے ہو ٹلوں میں پیٹھنے والا آدمی ہے۔“

پھر تو بڑا آدمی ہوا ”پال تم سخن سے بولا جاہ ہنسا“ باقی اللہ جانے

”ایلی سے پوچھیں تو ہی“ بھاٹے کہا

”فضول“ جاہ بولا جس بات کو اس نے ہم سے خود جان بوجھ کر راز رکھا ہے اور پھر لوگوں کے پرائیویٹ معاملات میں دخل دینا جمال نے بھی پہلے روز مذکورہ چھیڑا تھا۔

”یار مجھے خواہ مخواہ پٹوا دیا“ وہ بولا میں چیختا چلاتا رہا کہ میں نہیں ہوں لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنبھالی۔ اور پھر اندر لے جا کر پھر سے پٹائی شروع کر دی پھر دھونس جمانے لگے میں نے ہزار بار کہا کہ حضور میں نہیں ہوں۔ آپ غلط آدمی کو پکڑ لائے ہیں لیکن وہ میری بات ہی نہیں سنتے تھے وہ تو شکر ہے تم واپس آگئے اور تمہاری آواز سن کر میں نے شور مچا دیا کہ وہ ہے وہ الیاس اگر تم نہ آتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔

یہ قصہ سنانے کے بعد وہ الیاس سے پوچھتا رہا کہ اس کے ساتھ سفید منزل والوں

نے کیا سلوک کیا۔ ایلی نے مختصری بات بتا کر قصہ ختم کر دیا۔

دو دن تو ایلی چپ چاپ اس وسیع ویرانے کو حیرت سے گھوٹا رہا جو اس کے ارد گرد پھیلا ہوا تھا۔ تیرے روز اس دھند لکے میں روشنی کی ایک کرن دکھائی دی ڈاک سے ایلی کے نام منصر کی ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا از راہ کرم مجھے شام کے وقت میرے وفتر میں ملئے۔ نیچے وفتر کا مفصل پتھر تھا۔
خط موصول ہونے کے بعد ایلی کے گرد و پیش پھر سے استوار ہو گئے۔ چیزیں پھر سے اپنے اصلی روپ میں آجائیں ہو گئیں۔ آسمان سمبا شہر پھیل گیا۔ نہ جانے کیوں بلا یا ہے ایلی نے سوچا شاید کیس اپ لیس کے حوالے کر دینے کا ارادہ ہو۔ یا شاید پھر سے تحقیق کرنی ہو۔ چاہے پچھلی ہو چاہے اس ملاقات کی نوعیت ضرر سا ہو۔ پھر بھی ملاقات تو ہو گی چاہے متنی ہی ہی ایک تعلق تو استوار ہو گا اور پھر منصر کا قرب اس کے گدے سے ہاتھ پاؤں اس کے ہونٹوں کا ختم اس کا ذہانت بھرا حسین چہرا ایلی بے حد خوش تھا۔

النصار منصر

شام کے وقت جب وہ وفتر پہنچا تو منصر نے اس کی آمد کو خاص اہمیت نہ دی۔
”بیٹھئے“ وہ بولا ذرا میں کام ختم کر لوں۔ سگرٹ پیجیے اس نے پیکٹ ایلی کی طرف بڑھا دیا اور یوں کام میں منہمک ہو گیا جیسے اسے خصوصی طور پر بلا یا ہی نہ گیا ہو۔
دیر تک ایلی وہاں بیٹھا رہا وہ حیرت اور احتراام بھری نگاہوں سے منصر کو دیکھتا رہا۔
پھر منصر اٹھا۔

آپ کو زیادہ دیر کے لیے انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟“ منصر نے اس کے قریب آکر بڑے اخلاق سے کہا ایلی اس کے رویے پر جیران تھا۔“
”آئیے“ منصر نے کہا ”اب چلیں“
لیکن ”ایلی نے کہا آپ نے تو مجھے بلا یا تھا“

”ہاں ہاں“ منصر بولا چلنے ناگھو میں پھریں گے
ایلی نے حیرت سے منصر کی طرف دیکھا۔

کسی جگہ پیٹھ کر باقی کریں گے ”منصر نے پینٹر اپدلا“

منصر نے ایلی کو اپنے موڑ سائیکل کے پیچھے سوار کر لیا اور وہ دونوں چل پڑے۔

سفلو ہوٹل میں پہنچ کر منصر نے سرسری طور پر کہا

”میں نے سوچا آج شام اکٹھے برس کریں۔ آپ تو سارا دن مطالعہ کرتے تھک جاتے ہوں گے شام کو ڈرائی فرنسی ہی ہی“

ایلی سوچ رہا تھا کہ کہاں وہ باہر نکال دوسرا بد معاشر کو۔ اور کہاں یا کٹھے شام برس کرنے کی تجویز اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اگئے اکٹھے رہنے کے بعد منصر نے اشارتاً بھی کسی ایسی بات کا ذکر نہ کیا تھا جو گز شستہ واقعہ سے متعلق ہو۔ وہ نہایت بے تکلفی اور گرم جوشی سے ایلی سی باقی کر رہا تھا۔ جیسے دونوں بہت پرانے دوست ہوں۔

انصار منصر کی شخصیت کو دیکھ کر ایلی بھونچ کارہ گیا۔ وہ ایک خوبصورت اور پیارا جوان تھا۔ اس کا لباس سادہ ہونے کے باوجود نقیض تھا۔ جس میں رنگوں کا حسین امترانج تھا۔ اس کی حرکات میں لے تھی۔ پاتوں میں مزاح کی جھلک تھی۔ مزاج نگین تھا اور شعروخن ادب اور آرٹ سے لگا تھا اور اس کی علمی معلومات بہت وسیع تھیں۔

منصر نے جب ایلی کو ناٹھر کے دروازے پر موڑ سائیکل سے اتنا رات وہ کہنے لگا اگر اعتراض نہ ہو۔ میرا مطلب ہے اگر آپ کو کوئی پروگرام نہ ہو اور تعلیم کا حرج نہ ہو تو کل شام کو دفتر آ جائیے گا۔

اس کے بعد ایلی کا معمول ہو گیا کہ سارا دن وہ کتاب سامنے رکھ کر شام کے خواب دیکھتا اور شام کو منصر کے دفتر میں پہنچ جاتا اور پھر جب منصر کام سے فارغ ہوتا تو وہ

اس کے موڑ سائیکل پر یوں بیٹھتا جیسے شاہی تخت پر بیٹھا ہو۔ شاہ کا جلوس سڑکوں پر گھومتا۔ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے اور ادب سے صفائی ہو جاتے کوئی نس بجالاتے۔ جب وہ سفلو ہوٹل میں پہنچتے تو یہ رے تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

اگرچہ منصر کی عادت تھی کہ وہ عالمانہ باتیں کرنے سے احتراز کرتا تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی بات چلتے چلتے منصر کے منہ سے انکل جاتی جسے ایسی یوں حفظ کر لیتا جیسے وہ قرآن کریم کی آیت ہو۔ عالمانہ بات چھوڑ دیئے منصر کوئی بھی ایسی بات کرنے سے احتراز کرتا تھا۔ جس سے اس کی برتری ثابت ہو دیا جو ایسی کو احساس مکتری دلاتے۔ عجیب بات تھی یہ کہ منصر نے کبھی ایسی کو اس حقیقت کا احساس نہ دلایا تھا کہ وہ سادی کا بھائی ہے یا اسے اس گھرانے سے کوئی تعلق ہے جہاں ایسی پر چوری کا الزام لگایا گیا تھا۔ منصر نے اس دو ران میں التزاماً اپنے گھر کے متعلق صرف ایک بات کی تھی اور وہ بھی سرسری طور پر کہنے لگا

”الیاں صاحب آپ سفید منزل کی طرف کبھی نہ جائیے گا۔ ورنہ بڑی قباحتیں اور پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی اور ممکن ہے، وہ رک گیا اور پھر معنی خیز مسکراہٹ سے کہنے لگا“ مجھے یقین ہے کہ آپ ایسی حماقت نہیں کریں گے لہذا جملہ مکمل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے علاوہ ایک روز ان جانے میں منصر کے منہ سے گھر کی بات انکل گئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سادی بیمار ہے اور کسی سپیشلیٹ کے زیر علاج ہے۔ اس پر ایسی چونکا تھا اس کا جی چاہتا تھا کہ منصر سے پوچھئے کہ اسے کیا تکلیف ہے اور اب کیا حال ہے لیکن منصر نے موضوع بدل دیا تھا اور ایسی میں پوچھنے کی جرایت نہ ہوئی تھی پھر کچھ دیر کے بعد وہ منصر میں اس حد تک جذب ہو کر رہ گیا تھا کہ وہ یہ بھول چکا تھا کہ سادی بیمار ہے۔

پھر شام گزارنے کے بعد رات کے گیارہ بجے جب منصر نے اسے اپنے موڑ

سائیکل سے اتارا تھا تو ناؤ گھر کی بیٹھیاں چڑھتے ہوئے دھنٹا ایلی کو یاد آیا تھا کہ سادگی بیمار ہے۔ وہ تڑپ کر مرٹا تھا کہ منصر سے پوچھے لیکن منصر جا چکا تھا۔ چند ایک روز کے بعد منصر نے خود ناؤ گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بھی اوپر نہ آیا تھا۔ شام کے وقت وہ ناؤ گھر کے نیچے باری نجات اور ایلی فوراً نیچے اتر آتا۔ روز مورث سائیکل کو ناؤ گھر آتے دیکھ کر بھا جاہ اور پال حیرانی سے ایلی کی طرف دیکھتے تھے اور جمال تو اسے دیکھ کر بیوں کھل جاتا جیسے خربوزہ مٹھاں کی وجہ سے پھٹ جاتا ہے۔

”یا را ایلی تم میں ہو“ وہ چلاتا ”یا را تم تو منزل تک پہنچ کر رہے۔ اب کیا ہے اب تو سب رام ہو گے میں بیوں“
لیکن ایلی کونہ جانے کیا ہوا تھا وہ جمال سے انتساب کرنے لگا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جمال کے رو برو ایلی احساس جنم محسوس کرتا تھا۔ جیسے اس نے جمال کے سفید رنگ اور سنہرے بالوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا ہو جیسے اس نے شکار کرنے کے لیے سنہرے بالوں کا دانا پھینکا ہو۔ اسی وجہ سے وہ اس سے زیادہ بات نہ کرتا بلکہ کوشش کرتا کہ اس کی بات کاٹ دے۔

نیم چھتی سے نیچے تو ایلی جاتا ہی نہ تھا۔ اگر بھی جاتا بھی تو کوشش کرتا کہ جاہ سے دوچار نہ ہو لیکن بھی کبھار جاہ تک بات پہنچ ہی جاتی اور وہ منہ بنا کر کہتا ”ہاں بھی آج کل ایلی صاحب او پنجی ہواں میں اڑتے ہیں۔ ہم رینگنے والے لوگ ان کی نگاہوں میں کہاں ساتے ہیں؟“

اور یہ ایک حقیقت تھی جب سے ایلی منصر سے واقف ہوا تھا اس کے دل میں جاہ کے لیے وہ جذبہ احترام نہ رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ کتابی دنیا میں محصور ہو۔ وہ اس رنگیں سے بے گانہ ہو جو زندگی کی جان ہے اس کی شخصیت میں کتابی دنیا میں محصور ہو۔ وہ اس رنگیں سے بے گانہ ہو جو زندگی کی جان ہے اس کی شخصیت میں کتابی علم کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔

کبھی کھار جب وہ منصر کے پاس ہوتا تو اسے خیال آتا کہ اگر میں نبی اے نہ کر سکا تو کیا ہو گا۔ یہ لوگ کیا سمجھیں گے شاید وہ ایک اندر گریجویٹ کو درخوار اعنانہ سمجھیں۔ اس روز گھر ۲ کرنسیڈگی سے کتابیں کھول کر بیٹھ گیا۔ لیکن کتاب کے صفحات سے سادی جھانکتی ”میں بیمار ہوں، منصر بنتا“ آپ مجھ سے بات کریں الیاس صاحب۔ برآہ راست ان سے بات نہ کرنے کا آپ نے وعدہ کیا ہے، ”سادی چلاتی اونہوں ان کا آپ سے تعلق صرف میری وجہ سے ہے ان کی مہربانیاں میری وجہ سے ہیں۔ ان میں نہ ہو جائیے گا یہ صرف آپ کی توجہ کو جذب کہنا چاہتے ہیں تاکہ مرکز ٹوٹ جائے۔

ایلی کتاب بند کر دیتا چھپر اسے محو کیا ہوتا کہ ذینے میں شہزاد کھڑی حرمان بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ مرتبا شہزاد آنکھیں جھکا لیتی اور زیر لب کہتی ”نہیں میں نے کچھ نہیں کہا“ اور پھر سیڑھیاں اترنا شروع کر دیتی۔

امتحان

ایک روز جب منصر اور ایلی دونوں ہوٹل میں بیٹھے تھے تو منصر نے غیر ازمعمول بیرے کو آرڈر دیتے ہوئے کہا ”دو چھوٹا“، ایلی چونکا دو چھوٹا اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ اس سے پہلے تو منصر نے کبھی دو کا آرڈرنے دیا تھا۔ شاید بے خبری میں لیکن منصر تو بے خبری میں بھی ہوشمندی کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ اس میں عقل اور جذبے کی عجیب آمیزش تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جذبہ حاوی رہتا تھا لیکن اظہار کرنا منصر کے نزدیک ستاپن تھا اس کا وقار اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔

بیرے نے دونوں چھوٹے میز پر رکھ دیئے۔ منصر نے سگرٹ پہنچنکتے ہوئے تعجب سے میز کی طرف دیکھا اور کیا میں نے دو منگالیے اچھا ”وہ ہنسنے لگا“ تو لیجھے پھر دللاً اس نے بات بدی

”چلو کیا حرج ہے آپ کوئی مولا نا تو ہیں نہیں۔ آئیے میرے ساتھ شامل ہو

جائے۔“

”میں نے آج تک“ ایلی نے معدودت کے لیے منہ کھولا ”اوہ“ وہ اک اندازِ محبوسیت سے بولا ”خدا را اب مسائل بیان کرنے نہ شروع کر دینا۔“

”لیکن،“ ایلی نے پھر کوشش کی ”آخر یہ لیکن ایک نہ ایک روپ تلوئے کا ہی چلنے آج ہی تھی،“ وہ مسکرا یا مجھے معلوم ہے کہ آپ نے بھی ہاں ہاں اب کیا پردہ ہے۔ اب کیا پردہ ہے اب کیا پردہ ہے سڑک پر موڑ بھونگنے لگی۔ اب کیا پردہ ہے ہوٹل کے سازندے نے ولمن پر لاہر لایا۔ ایسا یا اس بیٹھا ہوا ایک موٹا سکھ ہٹنے لگا ”سب پر دے ہٹادیتی ہے کیا چیز ہے۔“

وغتا ایلی کو خیال آیا کہ شاید منصر سوچی جبھی سکیم کے مطابق اسے پلا رہا ہے۔ پلانا چاہتا ہے تا کہ اس کا دل ڈوب گیا۔ شاید وہ ایلی سے سادی کی ملاقاتوں کے متعلق تفصیلات جاننے کا خواہ شمند ہے۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر اس نے انکار پر اصرار کیا تو منصر سمجھے گا کہ وہ اپنارا ز محفوظ رکھنے کے لیے انکار کر رہا ہے اس سے ثابت ہو گا کہ راز کا وجود ہے۔ ایلی نے اپنا آپ پتھر بنانے کی شدید کوشش کی۔ اس نے اپنے تمام تر عزم کو للاکارا کوئی بات زبان پر نہ آئے کوئی ایسی بات جس میں سادی پر حرف آئے۔ سادی کی عزت کا سوال ہے۔ پر وہ جوں کا توں قائم رہے گا۔ یہ دو گھنٹ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے نہیں بگاڑ سکتے۔ ایلی نے چھوٹا اٹھا لیا اس کا ہاتھ ذرا نہ کانپا۔ اور وہ اسے یوں غٹ غٹ پی گیا جیسے چھوٹا نہیں بلکہ شربت کا گلاس ہو۔ ایک ساعت کے لیے منصر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر وغتا مرد کر چلایا۔ پیر او و چھوٹا اور چار چھوٹے نگفٹے کے بعد ایلی نے محسوس کیا کہ اس کے اندر آگ لگی ہے۔ باہر ہوٹل پر ایک سرخ دھنڈ لگا چھائے جا رہا تھا۔ اور وہ پورے عزم سے اپنے آپ کو پتھر

بنانے میں مصروف تھا۔

”آپ کا امتحان کب ہو رہا ہے؟“ منصر نے پوچھا
ایلی کا جی چاہتا تھا کہ کہدے امتحان تو ہو رہا ہے متحن سامنے بیٹھا ہے
پندرہ روز کے بعد ہو گا ”وہ بولا“، مشن کالج میں منظر بناتے ہے۔

اس کے بعد منصر نے اسی ایک بار کہا کوئی بات کیجئے الیاس صاحب کچھ کہیے
پھر اس نے خود کچھ کہنا شروع کر دیا ”آپ نے وہ شعر نہیں؟“
نہ پوچھ حال میں وہ چوبی خل صحراء ہوں
لگا کے آگ جیسے کارروائی روانہ ہوا

کچھ دری تک وہ اسے گلکندا تارہ لے پھر بولابھی ”عریبے خد پسند ہیں۔ اور میں محسوس
کرتا جیسے مجھ میں سینکڑوں اشعار بے تاب ہوں اگرچہ میں آج تک اپنے خیال کو
شعر کا جامہ نہیں پہنا سکا۔ ایک عظیم کیفیت کو چند الفاظ میں کہہ دینا بڑی بات ہے۔
ہم تو بہت سارے الفاظ میں بھی نہیں کہہ سکتے۔ آپ کو کونسا شعر پسند ہے؟“ اس نے

پوچھا

ایلی کو اس وقت کوئی شعر یاد نہ آ رہا تھا

پھر دفعتاً منصر نے بات کا رخ بدلا ”ہاں تو الیاس صاحب ذرا اس واقعہ کی
تفصیلات تو بتائیے جو ہماری ملاقات کا موجب ہوا میں صرف اس لیے پوچھ رہا
ہوں“ ”وہ بولا“ کیونکہ میرے دل میں بے لائق استفسار پیدا ہوا ہے کسی خاص مقصد
کے تحت نہیں پوچھ رہا اور نہ اسی آپ کے بتانے پر کسی قسم کے نتائج پیدا ہوں گے“
ایلی نے شدت سے پتھر بننے کی کوشش کی وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ”دراصل بات
وہی تھی جو میں نے آپ کو بتا دی تھی“، ایلی نے کہا ”میں نے کوئی تفصیل چھپائی نہیں“

”ہوں“ منصر نے کہا ”پھر بھی“

”آپ پوچھئے کوئی خصوصی تفصیل“

”کیا ادھر سے ابتدا ہوئی تھی؟“ منصر نے کہا ”یا آپ کی طرف سے“
”ادھر سے نہیں“ ایلی نے کہا

”تو آپ نے ہی تحریک شروع کی تھی؟“

”ہاں“

”اور ادھر سے کیا در عمل ہوا؟“

”اظہار نفرت“ ایلی نے کہا
منصر ہٹنے لگا ”آپ میرے کام لے رہے ہیں“

”مجھے کال کا وہ خطاب دیا گیا۔“

”ہوں تو کیا آخری واقعے متعلق ہے تجویز آپ کی ہی تھی؟“
”ہاں“

”اس سے آپ کا مقصد کیا تھا؟“

”جنڈپ اور کیا میں نے سوچا نہیں“ ایلی نے جواب دیا

”آپ نے یہ نہ سوچا کہ کسی کی زندگی تباہ ہو جائے گی؟“

”نہیں“ ایلی نے کہا

”اور آپ کی تجویز منظور کیسے کر لی گئی؟“

میں نے خود کشی کی دھمکی دی تھی شاید اس لیے

منصر قہقہہ مار کر ہنسا

”اوروہ زیور کیا آپ کے کہنے پر لایا گیا تھا؟“

”نہیں بلکہ اگر وہ اپنی نہ ہوتا تو ہم جا چکے ہوتے“

”کیسے؟“

”میں نے اسے ساتھ لے جانے سے الکار کر دیا تھا“

”پھر آپ موقع سے بھاگ کیوں گئے؟“

”مجھے میرے دو ووست زر دتی گھیٹ کر لے گئے تھے“

”ہوں“ وہ قہقہہ مار کر بہسا آپ بھی خوب ہیں الیاس صاحب

”کچھ دری کے بعد اس نے پوچھا اگر آپ لوگ چلے جاتے تو کیا کرتے“

”شادی“ ایلی نے کہا

”ہوں“ منصر نے ایک بھر پور نگاہ ایلی پر ڈالی

آپ کو ادا دینیے والا کوئی تھا۔ میرا مطلب ہے جہاں سے امداد کی تو قع لگائی جا سکے۔

”نہیں“ ایلی نے کہا

”آپ کے والدین زندہ ہیں“

”جی“

”تو ظاہر ہے کہ وہ آپ کی مدد کریں گے“

”اوہ ہوں“ ایلی نے جواب دیا

”کیوں“ منصر نے پوچھا

”والد صاحب کی تین بیویاں ہیں“

”ہوں اور آپ کی اپنی والدہ“

”وہ ان کی پہلی بیوی ہے“ ایلی نے جواب دیا

”ایلی اٹھ بیٹھا اس کا ضبط ختم ہو چکا تھا ہوٹل کا وہ کمرہ لٹوکی طرح گھوم رہا تھا میز ایک دوسرے سے فکر ار ہے تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ کسی نالی میں گر کر بے ہوش ہو جائے گا“

منصر بار بار اسے کہہ رہا تھا کچھ کھائے نا لیکن تلے ہوئے آلوؤں کے علاوہ کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا

”بیٹھئے نا“ منصر نے کہا

”میری طبیعت ٹھیک نہیں“ ایلی نے جواب دیا

”چلنے میں آپ کو ٹھیک کر دوں“ منصر نے ایلی کو سائیکل پر بٹھایا۔ ایلی نے مضبوطی سے منصر کو پکڑ لیا۔ اور پھر ایلی کو اس وقت ہوش آیا جب سائیکل رک چکا تھا۔ اس نے سمجھا کہ ناؤگھر آگیا وہ بھونچ کارہ گیا۔ شاید نشے کی وجہ سے اسے ناؤگھر کا چھوٹا سا دروازہ پھانک لکھا تھا۔

”آئیے“ منصر نے آکر اپنا باتھاں کے شانے پر رکھ دیا
اور ”حیرت سے اس نے منصر کی طرف دیکھا وہ دونوں برقیہ منزل میں داخل ہو رہے تھے۔“

”ایک بات لہوں“ منصر نے نہ کرایلی سے کہا۔ پہلا تو ہم نے آپ کی بات تعلیم کر لی تھی لیکن اگر اب آپ کہیں کہ آج پینے کا آپ کا پہلا موقعہ تھا، تو وہ رک گیا“
بات قابل قبول نہیں“

”بیٹھئے منصر نے کہا ایلی نے کمرے کی طرف دیکھا یہ وہی کمرہ تھا جہاں وہ چند روز پہلے چور کی حیثیت سے داخل ہوا تھا اور آج لیکن آج تو اسے اپنی حیثیت کا علم نہ تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ واقعات پر اسرار طور پر خ بدلتے ہیں نہ جانے کیا ہونے والا ہے نہ جانے کیا ہوگا۔ ایلی کو کچھ سمجھنہ نہیں آ رہا تھا۔ منصر نے کئی بار اسے تاکیدا کہا تھا، ”ایسا صاحب آپ کا ہمارے گھر جانا یا کسی قسم کا کوئی رابطہ پیدا کرنا ہمارے لیے تکلیف کا باعث ہوگا اور اب جب کہ ہمارے دوستانہ مراسم ہو چکے ہیں اگر آپ نے چوری چھپے کوئی بات کی یا کوئی بات مجھ سے چھپائی تو مجھے دکھو گا۔“

”آپ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ یہاں آپ کو کیوں لا یا گیا ہے مجھے دفعتاً خیال آیا کہ اس حالت میں آپ کو اپنے لاج میں نہیں جانا چاہئے۔ ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ مجھے سُگرٹ پیجئے اور میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ آپ سُگرٹ نہیں پیتے۔ لیکن اس میں میرا قصور نہیں کیونکہ اس عمر میں کم و بیش لوگ سُگرٹ پینا شروع کر رہی

دیتے ہیں۔“

سائیکل پر ہوا کھانے کے بعد ایلی کی حالت اور بھی خراب ہو چکی تھی۔ اس کے تمام جسم میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ منہ سخت کڑا ہو رہا تھا طبیعت ماش کر رہی تھی۔ ”آپ کچھ دیر کے لیے یہاں آرام ہیجئے۔ لیکن جائیں،“ لیکن ایلی اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں ابھی آیا،“ کہہ کر منصر چلا گیا اور ایلی کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ پھر دفلٹا اس کی طبیعت گھبرا لی وہ باہر بھاگا۔ سامنے اس زینے کا دروازہ تھا جہاں وہ پہلے کئی ایک بارہ آپکا تھا ایک کرکنڈی گھولی اولاد اندر پہنچتے ہی شدت سے نے کتنا شروع کر دیا۔

تھے کے بعد اس کی طبیعت ہلکی ہوئی۔ اس نے اس کمرے کی طرف حسرت بھری نظر ڈالی۔ فرش پر ابھی تک سگرلوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ سیڑھیوں پر ایک ماچھس پڑی تھی۔ اسے ان ملاقاتوں کا خیال آگیا۔ یہاں وہ پیٹھے جایا کرتا تھا اور کوئی کہا کرتی تھی ”آپ پیٹھے کیوں گئے اٹھئے نا۔“

”آئیے نا،“ اس کی پشت پر منصر کھڑا تھا ”یہاں کھڑے کیا کرو رہے ہیں آپ۔“ اسی روز باتوں ہی باتوں میں منصر نے پردے کا موضوع چھیڑ دیا ”پردے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔“

”میں نہیں سمجھا ایلی نے کہا میرا مطلب ہے،“ منصر نے کہا جہاں تک اس گھرانے کا تعلق ہے آپ کی حیثیت ایک اجنبی کی ہے ایک بیگانے کی۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ آپ سے خصوصی سلوک کیا جائے۔ ایلی کو منصر کی بات سمجھے میں نہیں آ رہی تھی۔

منصر کہنے لگا ”اگر ہمارے لوگ آپ کے سامنے آئیں تو تخصیص کیوں کی جائے کیوں نہ وہ منظر عام پر آئیں سب کے سامنے۔“

”میں نہیں سمجھا“ ایلی نے جواب دیا

”وقت تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں سمجھ رہا، منصر چلا�ا“ اگر چہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ مسئلہ اس قدر ثیڑھا ہے کہ اور میں نے آج تک اس مسئلے پر غور نہیں کیا تھا۔ لیکن اب“ وہ خاموش ہو گیا اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی کشمکش میں گرفتار ہے۔

”جی“ ایلی نے کہا

”جی کیا“ وہ بولا کیا تھجھے آپ

”کچھ بھی نہیں“ ایلی نے کہا منصر نے ایک تھہر لے گایا

”تعجب کی بات ہے“ وہ بولا ہم دونوں اس قدر قریب ہیں بہت قریب اتنے قریب کہ آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا اور پھر ہم دونوں بیک وقت اس قدر بیگانہ ہیں اس قدر وو روکہ

منصر کے ”سگرٹ یہی“ اور سگرٹ تو آپ پیتے ہی نہیں ہاں تو میں کہہ رہا تھا کیا کہہ رہا تھا میں“ وہ ہنسنے لگا“ ہاں آپ نے داستوں سکی کاناول بر اور زکیر اموز وزور پڑھا ہے؟“

”جی نہیں“ ایلی نے کہا“ میں نے صرف ایڈیٹ اور کرامم اینڈ پنشٹ پڑھے ہیں۔“

”ضرور پڑھئے وہ بولا اسے پڑھئے بغیر آپ ہم کو نہیں سمجھ پائیں گے“

”آپ کی کتنی مشیریں ہیں؟“ منصر نے دفعتاً بات بدالی

”ایک“ ایلی نے کہا

”بڑی ہیں یا چھوٹی“

”بڑی“

”تو آپ نہیں سمجھ سکتے کہ چھوٹی بہن کا مفہوم کیا ہے“ منصر نے جوش اور جذبے

سے کہا

ایلی نے سوچا کہ شاید منصر نشے میں با تینیں کیے جا رہا ہے۔ لیکن خصوصی طور پر آج کیوں؟ وہ یہ نہ سمجھ سکا ”مجھے اپنی ہمشیر گان سے بے حد محبت ہے“ منصر بولا آپ اندازہ نہیں کر سکتے ہیں۔ بہر بال پر دے کا تو میں قاتل نہیں ہوں میرا مطلب رسی پر دے سے ہے۔ پر دے کے بارے میں آپ کا گیا خیال ہے اس نے ایلی سے

اپو چھا

”میں تو رسمی پر دے کو فضول سمجھتا ہوں“

”ہاں“ دفعتاً منصر نے بیٹھ رہا تھا کارخ بدلا۔ آپ کو ٹیکس سے پچپی ہے؟

”بھی ہاں کچھ کچھ ہوئیں میں لھیا اہستا تھا۔“

”آپ کو معلوم ہے کہ پنجاب ٹیکس پیش کیا چکا شپ کافائل ہو رہا ہے۔“

”بھی نہیں۔“

تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کل شام کے چار بجے لارنس باغ کی گراونڈ میں یہ میج ہو گا اور آپ ہمارے ساتھ وہاں جا رہے ہیں۔ آپ چار بجے وہاں از خود پہنچ جائیے گا۔ وہاں ملاقات ہو گی۔

منصر کی اس روز کی با تینیں ایلی کو قطعی طور پر سمجھ میں نا آئیں۔ نہ جانتے وہ رنگیا راجہ کیا کچھ کہہ رہا تھا شاید گپ ہائک رہا ہو۔ لیکن ان کی بات کرنے میں منصر کو کمال حاصل تھا اور اس حقیقت سے ایلی واقف تھا۔ پھر بھی اس روز کی با تینیں تو نہ کہی تھیں نہ ان کہی۔

منظر عام

اگلے روز جب ایلی ٹیکس میج کے میدان میں پہنچا تو اس کی حیرت کی انتہا ش رہی منصر کے ہمراہ سادی بائی اور ایک صدر خاتون تھیں وہ تینوں بے نقاب تھیں۔ ایلی انہیں دیکھ کر گھبرا گیا۔

”آئیے آئیے“ منصر چلایا ”یہ ہیں الیاس صاحب“ اس نے خاتون کو مخاطب کر کے کہا ”اوہ آپ والدہ صاحبہ ہیں اور انہیں“ اس نے سادی اور باجی کی طرف دیکھ کر کہا ”انہیں تو آپ جانتے ہیں“ ایلی نے جھک کر والدہ کو سلام کیا۔

ایلی نے شدید خواہش کے باوجود سادی اور باجی کی طرف نہ دیکھا اس میں ہم نہ پڑی۔ اسے منصر کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ پھر تھیص کیوں کی جائے۔ منصر نے سادی اور باجی کو منظر عام پر لانے سے گیرینہ کیا تھا۔ ایلی نے حیرت بھرے احترام سے منصر کی طرف دیکھا۔ کس قدر پر وقار تھا وہ چھوٹا سا خوب صورت آدمی۔

کھیل کے دوران میں ایلی نے دو ایک بار چوری چوری سادی کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے وہ سادی نہیں بلکہ سکندر ہو جو دریائے جہلم کے کنارے کھڑا ہو۔

کھیل کے وقفے میں والدہ کے اشارے پر منصر نے یہ رے کو آواز دی لیکن اس کی آواز کسی نے نہ سنی اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔

والدہ نے مسکرا کر ایلی کی طرف دیکھا۔

”آپ کے مزاج اچھے ہیں“ ایلی نے کچھ کہنے کے لیے کہا
وہ مسکرا گئیں اور پھر کہنے لگیں ”کبھی مجھ سے ملوٹا، مجھے تم سے باتیں کرتا ہے۔“
”جی“ ایلی نے جواب دیا

”گھر پر آئیے کوئی بارہ بجے کے قریب“ والدہ نے کہا

”بہت اچھا“ ایلی نے جھکی جھکی نگاہوں سے جواب دیا

”گھری دے دیجئے انہیں“ سادی چمک کر بولی

”جی“ ایلی نے سادی کی طرف دیکھے بغیر کہا ”کہیں دو بجے ن آ جائیں“ وہ بولی
”ضرور آنا پڑتا“ والدہ نے یوں جواب دیا جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو

”میں انتظار کروں گی“ والدہ بولیں اور پھر منصر کی آمد پر وہ دفعاً چپ ہو گئیں۔

منصر آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ والدہ صاحبہ کا وہ ”اوہ“ ایلی کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اس پر مسلط ہو گیا۔ اس کے عقب میں گھری پر معنی خاموشی تھی۔ مفہوم سے بہرین خاموشی میا وہ اشارہ اور کنایہ کی عظمت سے اس حد تک واقع تھے۔ ایلی حیرت سے اس معزز خاتون کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا سن پیچا سے لگ بھگ ہو گا اس کے چہرے پر وقار کی نسبت محبت کے نقوش زیادہ پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک حسرت زدہ مٹھاں تھی۔

اگلے روز دوپہر کے وقت جب ایلی سفید منزل میں داخل ہوا تو وہ اور وضاحت سے اس کے رو بروآ گیا۔ والدہ پہلے ہی سے اوپر جنگلے میں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ایلی کو دیکھتے ہی والدہ نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر تک وہ دستک دیئے بغیر دروازے پر کھڑا رہا پھر دروازہ کھلا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو دروازہ بند کر لیا گیا۔ محل منزل ویران پڑی تھی۔

رسی باتوں کے بعد والدہ نے کہا ”مجھے اپنی بچیوں سے بڑی محبت ہے بڑی محبت“ اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ کیا کروں میں مجھے کچھ بچھے میں نہیں آتا۔ اور جھوٹی تو بڑی ہی لاٹلی ہے بڑی ہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”تم بڑے اچھے ہو“ دفعتاً والدہ نے موضوع بد لاتم سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی

”مجھے تم سے اتنی ہی محبت ہے جتنی، وہ رک گئی“

”آپ کی بڑی نواش ہے“ ایلی نے کہا

”مجھے باتیں نہیں کرنا آتیں پیٹا“ وہ بولی

”جی“ ایلی نے اس رسمی جملے پر شرمندگی سی محسوس کی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس عمر خاتون کو یوں آغوش میں لے لے جیسے وہ ایک شخصی سی بچی ہو مگر اس میں ہمت نہ پڑی ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے بجا۔

آونا ادھر اس کمرے میں آ جاؤ اس بغلی کمرے میں آئیے اگر امان کو پتہ چلا کہ تم اس گھر میں آئے ہو تو قیامت آ جائے گی۔

”امان؟“ ایلی نے دہرایا
ہاں وہ ہمارا عزیز ہے اللہ رکھے یہی کامنیٹر ہے۔ چھوٹی کی منگنی ابھی نہیں ہوئی
امان بڑا جو شیا ہے۔ پتہ نہیں کیا کروے آدھر آ جاؤ
جب وہ بغلی کمرے میں داخل ہو تو فریب ہی کے ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ
دونوں ساوی اور بیوی بیٹھی آپس میں کاما پھوٹی کر رہی تھیں۔

”بیٹھ جاؤ بیٹھا۔ اب تم سے کیا پروہ ہے بیٹھ جاؤ“

ایلی سر جھک کر ادب سے بیٹھ گیا۔

ساوی نے باتی کے کان میں کہا ”دو پتھ لا دو انہیں باتی“ اور اس نے جان بو جھ کر ایسی آواز میں کہا کہا میں سن لے۔

ایلی خاموش بیٹھا اور والدہ سے رسمی باتیں کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔

”دیکھو تو“ ساوی پھر بولی جیسے منہ میں زبان نہ ہو

”اب میں کیا کھوں؟“ ایلی نے والدہ کو منا طب کر کے کہا

”کیا کہا تم نے میں نہیں سمجھی، وہ بولیں

”میں نے عرض کیا کہ؟“ ایلی رک گیا

”جملہ کمکل کر دو باتی“ ساوی پھر بولی

”جملہ نہیں، وہ بولا“ کہا نی

”وہ کیا میں تھوڑا کروں گی“ ساوی قہقہہ مار کر نہیں

”نه جانے تم کیا کہہ رہے ہو“ والدہ بولیں یہ کہہ کروہ اٹھو بیٹھیں ”میں ذرا دیکھوں تو امان تو نہیں آیا“ یہ کہہ کروہ باہر نکل گئی۔

”یہ کس مشکل میں ڈال دیا مجھے نہ جی“ وہ چک کر بولا

”اپنی نہ اٹھانے کی سزا بھی تو ملنے چاہیے باجی انہوں نے ضد کر کے سب کچھ کھو دیا“

”کھویا تو نہیں پالیا ہے“ ایلی نے کہا

”انہوں پالیا ہے“ وہ بولی بڑی ہمت والے تو دیکھو یہ تو بادولت کی محنت کا نتیجہ ہے

”جی“ ایلی نے کہا مابدی و لست تو غش کھا کر رہتا جاتے ہیں وہ تفہیہ مار کر بھی غش نہ کھاتے تو بات بھی نہ بنت

”میں نے ساتھا تم بیمار تھیں ساوی“

”اپنی تو وہی بات ہے کہ فراق یا رہیں گل گل کے بن گئے ہاتھی“ وہ ہنسنے لگی

”جھوٹ“ باجی نے کہا

”خاموش باجی“ ساوی اٹھو بیٹھی

”وراصل“ باجی نے بات کرنے کی کوشش کی

”ایک لفظ منہ سے نکالنے کی اجازت نہیں“ ساوی نے کہا اور گل ”وہ ایلی سے مخاطب ہوئی“

”یوں ٹیکس بال پر نگاہیں جما کر بیٹھے رہے جیسے حافظ طوے پر جمائے رہتے ہیں“

”ایک گھنٹہ تباہ کر دیا۔ کیوں جی ہم سے بات بھی نہ کی“

”تم سے با تین کرنے کا مزالت تو چکھلایا“

”ابھی سے گھبرا گئے اور ہم تو حضور سے امید یں لگائیں بیٹھے ہیں وہ کیا ہوں گی“

سادی چمک کر بولی

”ایک کال کلوٹ سے“ ایلی رک گیا

”خاموش“ سادی نے ایلی کو ڈانگا ”ہائے باجی یہ تو ساری عمر معاف نہ کریں گے

مجھے“ وہ ہنسنے لگی

”اور وہ شہری بال خواہ مخواہ پٹ گیا بیچارا“

”ہئے واقعی“ باجی بولی

”دونوں طرف پٹ گیا“ ایلی نے کہا

”پچھے کہتے تھے وہ“ سادی نے پوچھا

”کہتا تھا یا ریڑ کیاں بھی کیا ہوتی ہیں“ ایلی پچھلے بھی پچھے مجھے میں ہی نہیں آتیں،“

”آپ انہیں ساتھ کیوں لائے تھے جی ساتھ لا کر پٹوادیا“ سادی نے پوچھا

”خود ضد کر کے آیا تھا“ ایلی نے کہا

مجھے حیرانی ہے ”سادی ٹھی انہوں نے انہیں کیوں پکڑ لیا۔ آپ کو کیوں نہ پکڑا“

”اس میں حیرانی کی کیا بات ہے“ ایلی بولا

”کیوں؟“ باجی نے پوچھا

”صنہری رنگت والی گوری کیسا تھا گفاظ ہی ہونا چاہئے تا“

”بس ان سے بات بھی نہ کرو باجی“ سادی غصے میں اٹھ بیٹھی

”مجھے دیر ہو گئی“ والدہ نے داخل ہوتے ہوئے کہا لیکن اماں نہیں ہے چلو فکر تو دور

ہوا۔

کیرا موز و وز

اس کے بعد ایلی کے شب و روز میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ وہ صرے یا
تمیرے دن اسے گھر بلا یا جاتا۔ وہ چاروں چھوٹے کمرے میں بیٹھ جاتے سادی
زیر لب بات چھیڑتی۔ ایلی والدہ سے با تین کرتا لیکن روئے خن سادی کی طرف

ہوتا۔ وہ دونوں بھتی۔ چھیڑتیں اور ایلی کے جواب پر والدہ حیرانی سے کہتی میں نہیں
بھتی

پھر والدہ امان کو دیکھنے کے لیے باہر چلی جاتیں اور وہ اکیلے وہ جاتے اور پھر وہ
بچوں کی طرح لڑتے جھگڑتے تھی کہ ہاتھاپائی کی نوبت آ جاتی اور والدہ واپس آ جاتی
اور ان کا وہ شور شر ابا پھر سے دب کر اشارات کی شکل اختیار کر لیتا۔

شام کو ایلی منصر کے دفتر جا پہنچتا اور پھر لا ہو رکی سرگوں پر شاہ کی سواری لٹکتی اور
لوگ بصد ادب و احترام دوڑھی کھڑے ہو کر کوشش بجالاتے ہو اور پھر ہوٹل میں وہ اس
عظیم شخصیت کے رو بروادب و احترام کے جذبات کے لیے بیٹھ جاتا اور حیرت سے
اس کی طرف دیکھتے جاتا۔ اسے منصر سے محبت ہو چکی تھی۔ والہانہ محبت
پھر ایک روز جب وہ چاروں چھوٹے کمرے میں بیٹھے با تینیں کر رہے تھی تو
 دروازے پر کسی نے لٹھ دے ماری۔

”دروازہ کھولو“ کوئی راکشش چکلھاڑا
والدہ صاحبہ نے آواز سنی چہرا زرد پڑ گیا ”ہے“ وہ ہاتھ ملنے لگیں اب کیا ہو گا۔ امان
کو پتہ چل گیا۔

”کون ہے“ اماں نے پوچھا
”میں ہوں اماں“ وہ چیختے لگا دروازہ کھولو
”اے ہے“ اماں بولیں اس وقت کیا ہے ہم کمرے میں بیٹھی با تینیں کر رہی ہیں
مجھے معلوم ہے ”وہ چلا یا کہ کمرے میں کیا ہو رہا ہے میں جانتا ہوں دروازہ کھولو“
اس نے دروازے پر کے مارنے شروع کر دیئے۔ کھول دو ورنہ میں اسے توڑ دوں
گا۔

”کھولتی ہوں“ اماں بولیں ”ذر اٹھر و تو“
”ابھی کھولوا بھی میں اس کی گردن مروڑ دوں گا“ وہ چلا یا

”کس کی گردن مروڑ دو گے“ ماں نے نہ کہا

”مجھے معلوم ہے کس کی گردن مروڑ نا ہے مجھے، وہ غرایا“

”ان لڑکیوں نے بگاڑا کیا ہے تمہارا“

”بعد میں انہیں بھی دیکھ لوں گا میں“

”ایسی دھمکی ہے تو نہیں کھولتے ہم توڑ دروازے کو“ ماں بولی

”اچھا“ ان نے دانت پیسے کہاں ہے میری بندوق، وہ دیوانہ وار سیڑھیاں

چڑھنے لگا

یا اللہ یا اللہ“ اماں غبرا کر دھمکیں مانگنے لگیں“

”میں جانتا ہوں، ایلی نے کہا

”وہ گولی چلا دے گا چلا دے گا“ اماں نے کہا

”ویکھوں گی میں کیسے چلا گئیں گے“ سادی جوش میں آگئی اس نے ایلی کا ہاتھ

ٹھاہلیا۔

”مجھے جانے دو سادی“ ایلی نے کہا

”نہیں میں ساتھ جاؤں گی۔ میں آپ کو گھر چھوڑ کر آؤں گی“ غھے میں سادی کی

آنکھوں سے انگارے جھٹر رہے تھے۔

”سادی“ ماں کی آنکھیں گویا ابل کر باہر نکل آگئیں

”پہلے مجھے گولی مارنا پڑے گی انہیں چلتے، وہ ایلی سے بولی

”سادی یہ تمہاری عزت کا سوال ہے مجھے جانے دو“ ایلی نے کہا

اماں سادی کے پاؤں پڑ گئی

اماں بھاگا خوش قسمتی سے صد دروازے کا ایک پٹھ کھلا تھا۔ دروازے میں پہنچ کر

وہ رک گیا۔ دیوار کے ساتھ لگ گیا تاکہ اوپر سے اسے کوئی دیکھنے سکے کافی دیر وہ

کھڑا رہا۔ پھر جب شور سے معلوم ہوا کہ اماں زینہ اتر رہا ہے تو ایلی چپکے سے پڑوس

کے مکان کی ڈیورٹھی میں داخل ہو کر کونے میں دبک گیا۔ پھر امان گلی میں چلا رہا تھا
کہاں ہے وہ کہاں ہے

ایک اوپرے لمبے نومند مرد کو ہاتھ میں بندوق لیے دیکھ کر گلی کی تمام لوگ کھڑکیوں
میں آگئے وہ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے
”کہاں ہے وہ کہاں ہے وہ“، امان گلی میں یوں چکر کاٹ رہا تھا جیسے شیر پنجرے
میں چکر کاٹتا ہے۔ پھر منصر آگیا اور امان کو پکڑ کر اندر لے گیا۔
عین اس وقت کوئی اس ڈیورٹھی میں داخل ہوا جہاں ایلی چھپا ہوا تھا۔ پیشتر اس
کے کہ وہ ایلی کو دیکھتا ایلی کو نہ سے نکل آیا اور معصومانہ انداز سے پوچھنے لگا جی یہ
مولوی محمد علی کا گھر ہے
”محمد علی کون محمد علی“ نووار نے مشلوگ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا
جو اسلامیہ کالج میں پروفیسر ہیں اس نے کہا
”نہیں،“ نووار دیکھا ایں کام مکان نہیں

تکلیف معاف کہہ کر وہ باہر لکلا اور گلی میں اس سمت کو چل پڑا جونا و گھر سے بر عکس
جائی تھی لارنس باغ میں پہنچ کر ایک پلاٹ میں وہ ڈھیر ہو کر گرد پڑا۔
ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر امان کون تھا اس سے ان کی والدہ کیوں
خالف تھی وہ کس کی گردن مروڑ نے کی بات کر رہا تھا۔ پھر وہ چیخ کیوں رہا تھا۔ بھلا
بندوق کی کیا ضرورت تھی اور یوں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے اور محلے والوں کو اکٹھا
کرنے میں کیا مصلحت تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کے روپ و منصر کھڑا
مسکرا رہا تھا ”ایاس صاحب آپ نے داستوں کی کی را درز کیرا موز و وز نہیں پڑھی
(Brothers Karamozoves) ضرور پڑھئے۔“

ایک اور
شام کے قریب نیم چھتی میں لیٹے ہوئے ایلی کو یاد آ گیا کہ ایس منصر سے ملنے جانا

ہے چونکہ خصوصی طور پر منصر نے طے کر رکھا تھا کہ اس روز وہ دفتر میں ملیں گے۔ لیکن ہمت نہ پڑی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن انہنہاں محال تھا۔ چلو نہ سہی اس نے سوچا کوئی بہانہ بنادیا۔ اور وہ پھر لیٹ گیا۔

دفلٹ اسے پھر خیال آیا۔ نہ گیا تو منصر مجھے گا کوئی خصوصی بات ہے۔ اور وہ پھر کا واقعہ اس کی نظر میں حقیقت کا روپ اختیار کر لے گا اور وہ مجھے گا کہ واقعی ایسا سفید منزل میں گیا تھا۔

”نمیں نہیں وہ اٹھ بیجا ہی نہیں ہو سکتا نہیں ہو سکتا“، منصر پر یہ ظاہرنہ ہونے پائے کہ میں وہاں جاتا ہوں۔ شام کے وقت جب وہ منصر کے دفتر میں پہچا تو منصر کے طبعی اخلاق کے باوجود اس کے انداز سے تلقی کا اظہار ہو رہا تھا۔

”میں فارغ ہو لوں تو ابھی چلتے ہیں“، منصر نے حسب معمول کہا ”آج پریشان معلوم ہوتا ہے شاید دوپھر کے واقعہ کے متعلق کبیدہ خاطر ہے۔ ضرور مجھ سے استفسار ہو گا نہیں میں کبھی تسلیم نہیں کروں گا“، ایسی سوچ رہا تھا اس میں امام کی عزت کا سوال ہے امام کتنی قابل تعظیم ہے لیکن امام نے امام کا بھی خیال نہیں کیا نہ جانے کون ہے وہ امام پھر وہ منصر کی طرف دیکھنے لگا۔ منصر اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہی حسین اور پر فیافت چھرا۔ وہی شان استقمع وہی وقار۔ لیکن ان سب پر پڑھ دگی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں جاذبیت کے باوجود شکستگی کی جھلک تھی جیسے پیانے میں بال آ گیا ہو۔

ایسی نے شدت سے محسوس کیا کہ منصر دکھی تھا۔ اگرچہ وہ اپنے دکھ کو چھپانے کی کوشش میں شدت سے مصروف تھا۔

”پریشان سے دکھتے ہیں آپ“، اس نے منصر سے کہا وہ چونکا ہوں ”اس نے ہنسنے کی کوشش کی آج ایسا کام آن پڑا ہے کہ“

”تو دفتری پر پیشانی ہے،“ ایلی نے کہا
”اور کیا ہو سکتا ہے؟“ وہ بولا

لیکن ایلی نے محسوس کیا کہ وہ بات ٹال رہا ہے۔ ظاہر تھا کہ اس کے احساس و قار
پر ضرب پڑ گئے ہے ورنہ دفتری معاملات کو اتنی اہمیت کون دیتا ہے اور پھر منصر ضروریہ
دوپہر کے واقعہ کا اثر ہے۔ ورنہ دفتری معاملات کو اتنی اہمیت کون دیتا ہے اور پھر منصر
ضروریہ دوپہر کے واقعہ کا اثر ہے۔ ایلی نے محسوس کیا کہ تمام ترمذہ داری ایلی پر عائد
ہوتی ہے وہی ان کی پریشانی اور دکھ کا باعث ہے۔ احساس گناہ سے اس کی نس نس
بھیگ گئی۔

جب وہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے تو منصر نے کہا کیا اتفاق سے آج آپ
ہماری گلی سے تو نہیں گزرے تھے۔

ایلی چونکا اور سوچنے لگا منصر کا سوال اس کی خوش اخلاقی پر دلیل تھا
”میرا مطلب ہے“ منصر نے کہا شاید آپ ادھر سے گزرے ہوں
ایلی کا جی چاہتا تھا کہ چلا چلا کر کے نہیں نہیں یہ بہتان ہے دروغ بیانی ہے۔ لیکن
منصر کے دکھ بھرے چہرے کو دیکھ کر نہ جانے اسے کیا ہوا اس نے اثبات میں سر ہلا
دیا۔

”تو آپ ادھر گئے تھے؟“

”بھی“

”گھر گئے تھے“

”بھی ہاں“

وہ سوچ میں پڑ گیا

”خود سے گئے تھے“ اس نے سراٹھا کر پوچھا

”بھی ہاں“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے“ وہ بولا آپ مذاق کر رہے ہیں یا
”خود سے گیا تھا“

”بیرا“ وہ چلایا ایک بڑا ایک اجلدی ایک بڑا

تعارف

اس روز والپسی پر منصر ایلی کو اپنے گھر لے گیا۔ اسے گھر میں بٹھا کر اس نے
آوازیں دینا شروع کر دیا۔ امان صاحب ہوں تو انہیں ذرا بیچے بھیجے ابھی۔
امان ایک اونچا میسا جات نہیں تھی۔ انداز میں وہ بات نہیں تھی۔ جو منصر اور سادی
میں بد رجہ اتم نظر آتی تھی ”آپ کو اپنے نئے ووست سے ملواؤں“ منصر نے کہا
یہ ہیں الیاس صاحب

اماں چونکا لیکن جلدی اس نے اپنے آپ پر قابو پالی

”آپ میرے عزیز ہیں“ منصر نے امان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بھائی
ہی سمجھ لیجئے بس فرق صرف اتنا ہے کہ یہ زمیندار ہیں اور میں مزدور
اماں نے کوئی استفارہ کیا بلکہ چپ چاپ بیٹھ کر ایلی کو بغور اور بے تکلف دیکھنا
شروع کر دیا۔ غالباً وہ ایلی کو جانچ رہا تھا۔ ایلی کو یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو
دو پہر کے وقت شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا اور پھر بندوق لے کر اس کے پیچھے بھاگا
تھا۔

”اماں صاحب کا گاؤں یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں اگر آپ کبھی ان کے ہمراہ
گاؤں جائیں تو آپ کو معلوم ہو کر زمیندار کس شے کا نام ہے“ منصر ہنسنے لگا۔ ”اگر یہ
جلال میں ہوں تو میز پر پڑا ہوا کانچ کا گلاں جلت رنگ کی طرح بجھنے لگتا ہے اور ہاں“
منصر نے کہا۔ ”آپ میرے دوسرے بھائیوں سے ملے ہی نہیں ان سے بھی تعارف
ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ آج اتفاق سے آپ یہاں آئے ہیں تو ان سے بھی مل
لیجئے۔ امان صاحب آپ اور پر جائیں تو انور اور محمد علی کو بھیج دیں شکریہ۔“

امان اٹھو بیٹھا اور جواب دیئے بغیر چلا گیا۔

نور ایک شوخ نوجوان تھا جس کی آنکھیں بے حد جاذت تھیں اس کے خدوخال بہت موزوں تھے۔ ان دونوں وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ محمد علی کی آنکھیں دکھنے والی تھیں انور کی طرح دیکھنے والی نہیں۔ اس کے چہرے پر خوابوں کا دینیز پر وہ پڑھتا تھا۔ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خوابوں کی بستی سے باہر نکل کر حقائق کی دنیا کو دیکھنے سے گھبرا تا ہو۔ وہ والپن کا رسیا تھا اور اس کے انداز میں برپا کے گیت کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔

”باقی رہارا نا؟“ مصر کے تعارف کرنے کے بعد کہ ”وہ بیہاں نہیں الہذا اس وقت اس سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“
”آپ شاید سوچ رہے ہیں کہ یہ تعارف کیوں کرانے کا رہے ہیں آپ سے۔ آپ سے یہ الفاظ خود ہی کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ ہم نے آپ کو اپنا لیا ہے الیاس صاحب“

” ذرہ نوازی ہے“ ایلی نے کہا

”نہیں اس میں ذرہ نوازی کی بات نہیں عام حالات میں شاید آپ کو درخواست نہ سمجھا جاتا۔ حالات کا تقاضا ہے کہ آپ کو اپنا لیا جائے اور اگر اپنا لیا جائے یعنی اگر اپنا لیا ہی ہے تو کیوں نہ فراغ دلی کو کام میں لایا جائے“ وہ خاموش ہو گیا۔

”والدہ صاحبہ مجھ سے زیادہ سمجھدار ہیں“ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر بات شروع کی ”اور حقیقت یہ ہے کہ ہم سب ان کے تابع فرمان ہیں“ وہ ہنسنے لگا ”دیکھیے“ وہ پھر جوش میں بولا ”اس سے یہ اندازہ نہ لگا لیجئے گا کہ یہ ایک وعدہ ہے کسی قسم کا واضح یا مبہم وعدہ اس سلسلے میں کرنے کا میں مجاز نہیں ہوں کیونکہ اس معاملے میں میری کوئی حیثیت نہیں۔ البتہ یہ ہمارے خلوص کا نشان ضرور ہے۔“
”ہم سب مخلصانہ کوشش کریں گے کیونکہ آخری فیصلہ والد صاحب نے کرنے ہے جو

اس وقت یہاں نہیں اور جنہیں ابھی تک حالات کے متعلق مطلع نہیں کیا گیا۔ نہ جانے انہیں کب مطلع کیا جاسکے گا۔ چونکہ دشمنی کا تقاضہ ہے کہ یہ بات والد صاحب کی خدمت میں کسی احسن انداز سے پیش کی جائے خیراب آپ سفید منزل میں آ سکتے ہیں لیکن مناسب ہو گا کہ آپ یہاں اس وقت تشریف لا یا کریں جب میں یہاں موجود ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ اس چھوٹی سی تفصیل کو اہمیت دیں گے۔

اس روز ایلی ناک گھر پہنچا تو اس کی خیالات بے حد پر یثاب تھے۔
راست گو

اس روز کے واقعات کی قدر بحیث تھے سفید منزل کے تمام افراد کس قدر انوکھے اور ولچپ تھے اور ان کے کرداروں میں کس قدر تنوع تھا۔ خاموش غم زده بائی۔ زندگی اور رنگینی سے بھر پور سادگی، محبت اور خلوص بھری والدہ رنگ اور وقار سے پر منصر اور سادہ اور پر جوش امان، ذہنی طور پر وہ سب ایک دوسرے سے دور تھے لیکن جذباتی طور پر وہ ایک ہاتھ کی انگلیوں کے مصدقہ تھے۔

مسلسل دو روز تک ایلی ان بیتے واقعات کو ذہن میں دہراتا رہا۔ گذشتہ چند ایک ہفتوں میں کیا کیا واقعات بیت گئے تھے۔ اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ وہ واقعات اس پر بیتے ہیں اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایلی نہ ہو بلکہ کوئی اور ہو۔ وہ اپنی شخصیت کا دورخانہ پر شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔

تیرے روز ڈاک سے اسے سادگی کا خط موصول ہوا جس میں سادگی نے اس کی راست گوئی کا مذاق اڑایا تھا۔

لکھا تھا

میرے راست گوا میں بنا تی ہوں آپ بگاڑتے ہیں میں چلتی ہوں آپ بکھیرتے ہیں میں سیتی رہوں آپ کاٹنے میں مصروف رہئے دیکھئے کہیں آپ پر جھوٹ بولئے

کافر د جرم نہ لگ جائے۔ چاہے کچھ بھی ہوا اپنی راست گولی قائم رکھئے۔

تو ب آپ کی اس روز کی راست گولی کی وجہ سے کتنا ہنگامہ برپا ہوا۔ اتنا ہنگامہ ہوا کہ امان صاحب کی بندوق بھی بھول گئی۔ ایک راستہ نکالا تھا وہ بھی آپ نے مسدود کر دیا۔ کئی بار کہہ پکی ہوں کہ انہیں برآمد راست آپ سے کوئی لگاؤ نہیں۔ ان کا بس چلے تو نہ جانے کیا ہو جائے۔ یہ لگاؤ محض میری وجہ سے ہے لیکن آپ ہیں کہ راستے سے لگن لگا رہے ہیں اور منزل کو بھولے جا رہے ہیں۔ اس طرح آپ کو حوجائیں گے اور میری کوششیں بے اثر ہو جائیں گے۔

مگر آپ ایسا نہیں لڑیں گے۔ کہہ جو دیا نہیں کریں گے خدا کے لیے ایسا نہ کچھ سادی کا خط پڑھ کر ایں کو بے حد فتوں ہوا۔ ظاہر تھا کہ اب سادی سے ملاقات نہ ہو گی ادھر منصر بھی دو ایک روز کے لیے باہر چلا گیا تھا لہذا اس سے ملاقات کی صورت بھی نہ رہی تھی۔

ایں نے کتابوں کی طرف توجہ مبذول کی لیکن اس کا دل مطالعہ سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ لہذا امتحان کی تیاری کرنے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ سارا دن وہ نیم چھتی میں کتاب اٹھائے پڑا رہتا۔ سوچتا اور پھر تک کر پڑ جاتا۔ وقت اس کے لیے گویا حکم گیا تھا۔ کسی چیز میں دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ ناڈ گھر پھیل کر جہاز بن گیا تھا۔ اور وہ جہاز کسی نامعلوم سمت میں بہہ رہا تھا بے مقصد ہے مصرف۔

منزل اور راہی

امتحان ختم ہونے کے بعد وہ سب اپنے گھر جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے جاہ بھاپال اور جمال جاہ کے لیے کہیں سے آنے میں قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی البتہ بھاپال اور جمال تینوں خوش تھے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ناڈ گھر چھوڑ رہے تھے۔

ایں سوچتا رہا اور آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ علی پور جانے سے پہلے وہ سفید منزل جائے گا تاکہ منصر سے آخری ملاقات کر سکے۔ دل ہی دل میں وہ چاہتا تھا کہ جب

وہاں پہنچے تو منصر موجود نہ ہوا اور سادی اسے جنگل سے دیکھ لے اور وہ دونوں اس چھوٹے کمرے میں جائیں گے اور سادی اس کی راست گولی کا مذاق اڑائے ”لبجھے باجی آگئے ہمارے راست گو۔ جھوٹ صرف ہم سے بولتے ہیں۔ دوسروں سے نہیں، کیوں جی ٹھیک ہےنا۔“

لیکن جب وہ امتحان سے فارغ ہو کر سفید منزل میں لپیا تو وہاں انور اور محمد علی کے سوا کوئی نہ تھا۔ انور نے اسے بتایا کہ وہ سب ہسپتال گئے ہوئے ہیں لیکن کوشش کے باوجود وہ یہ نہ معلوم کر سکا کہ آخر وہ ہسپتال کیوں گئے تھے۔

اسی روز امتحان کے بعد منصر اسے ملا تھا۔ امتحان کے دوران میں منصر سے تقریباً روز ملتا رہا تھا۔ پہلے روز جب ایلی پر چڑے گریبان سے اکا تھا تو اس نے دیکھا تھا کہ سامنے منصر اپنے موڑ سماں سکل پر آ رہا ہے اور منصر نے حسب عادت کہا تھا ”کیا عجیب اتفاق ہے میں ابھی لنج کھا کر آ رہا تھا۔ آئیے آئیے چلے آپ کو لے چلوں کہنے پر چ کیسا ہوا“، اس کے بعد ان کا معمول ہو گیا تھا کہ یہیں اس وقت منصر لنج کھا کر ادھر سے واپس آتا جب ایلی کے پر چے کا وقت ختم ہوتا اور سرسری طور پر اسے پوچھتا کہنے پر چ کیسا ہوا۔ اس روز بھی وہ اس سے ملا تھا اور سرسری باتوں کے بعد اس نے کہا تھا ”تو آج آپ جا رہے ہیں اور ناؤ گھر کے دروازے پر اسے موڑ سماں سکل سے اتار کر کہا تھا اچھا الیاس صاحب خدا حافظ۔ خط تو آپ لکھا ہی کریں گے میرا مطلب ہے جب کوئی ضروری بات ہو اور آپ تو لا ہو رہتے ہی رہتے ہوں گے علی پور قریب ہی تو ہے انشاء اللہ جلد ملاقات ہو گی۔“

اس روز منصر نے تو ہسپتال کی بات نہیں کی تھی۔

ایلی محروم واپس آگیا۔ اس کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ سامان باندھے یا جانے کی تیاری کرے لیکن سب تیار یوں میں مصروف تھے اور وہ لاج چھوڑ رہے تھے ناچار اسے بھی تیاری میں مصروف ہونا پڑا۔ لیکن اس کی تمام توجہ گلی کی طرف گلی ہوئی تھی۔

نہ جانے وہ لوگ کب ہپتال سے واپس آ جائیں لیکن گاڑی کا وقت آ گیا اور گلی میں سے موڑ ریا تا نگانہ گز رانا چاروہ جاہ اور بھاکے ساتھ تھا نگے میں سور ہو گیا۔ اس نے ناؤ گھر اور سفید منزل پر آخری حسرت بھری نگاہ ڈالی اس وقت ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ منزل کو چھوڑ کر رہا ہے، ان رہا ہو۔ منزل اس کے سامنے تھی لیکن وہ متضاور استے جانے پر مجبور تھا۔ کافی سڑک دوڑ رہی تھی۔ دوڑے جا رہی تھی گھوڑے کے سمیون نج رہے تھے جیسے کوئی چھاتی پیٹر ہا ہو۔ ریل گاڑی کے پیسے ان پر نہ رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ لاہور سمت رہا تھا نیلا آسمان چاروں طرف سے یورش کر رہا تھا چھائے جا رہا تھا مسلط ہوا جا رہا تھا۔

بیگم

علی پور پہنچ کروہ بلا سوچے سمجھے سیدھا محلے کی طرف چل پڑا۔ اس کا ذہن ایک خلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے قطعی طور پر احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے یا علی پور کے گلی کو چوں میں جا رہا ہے۔ اسے راستے میں کوئی نہ ملا۔ کچی حوالی سنان پڑی تھی۔ لائین مدد ہم لو سے جل رہی تھی۔ میدان میں اندھیرا تھا علی احمد کے مکان کے دروازے بند تھے چند ایک کھڑکیوں میں وہندی روشنیاں جھلما رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے چل رہا تھا۔

جب وہ شہزادے کے چوبارے میں پہنچا تو اسے کھلا دیکھ کروہ چوٹکا اسے یاد آیا کہ وہ تو باہر گئی ہوئی تھی۔ یہ دروازے کیسے کھلے ہیں اور میں اوہر کیسے آ گیا۔

سامنے چار پائی پر شہزاد بیٹھی تھی۔ قریب ہی ایک نومولود بچہ لیٹا ہوا تھا۔ شہزاد نے اس کی طرف دیکھا اور وہ یوں حیران بیٹھی رہ گئی جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہو۔ جانو چلانے لگی۔

”لو یہ تو ایلی آیا ہے۔“

”کون آیا ہے؟“ قریب ہی سے ان جانی باوقار آواز سنائی دی۔ اور پھر بیگم اس کے

سامنے آ کھڑی ہوئی۔

”ہے، شہزادی!“ ایلی کے لئے چائے بناؤ جانو منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ اتنی دیر کے بعد آیا ہے چلو آیا تو ہے“

وہ مسکرائی ”اب بھی نہ آتا تو اس کا کیا باکار لیتے۔ اب تو جا کھاں رہا ہے“ وہ براہ راست ایلی سے مخاطب ہو کر بولی ”اوہر کون ہے وہ تو سمجھی کا بل گئے ہوئے ہیں“ ایلی نے بیگم کی طرف دیکھا۔ بیگم بڑے رعب سے اسے گھور رہی تھی۔

”بیگم کو نہیں پہچانا تو ہے ایلی،“

بیگم سے وہ نام جانا پہچانا معلوم ہو رہا تھا

”اب یہ کیوں پہچانتے گا، بیگم نے کہا“ اب تو جوان ہو گیا ہے“

”جوان،“ شہزادی ”شکل تو دیکھو جوان کی جیسے راستہ کھو رہا اکلا ہو“

”راستہ کھو رہا اکلا ہو،“ کسی نے اس کے کان میں دہرایا۔ اس کی نگاہوں میں سفید منزل آ کھڑی ہوئی۔ راستہ اور چیز ہے منزل اور اساوی مسکرائی منزل!! منزل!!! مسجد پر چگاڈڑ چھپی ”چلو راستہ بھول کر ہی سہی،“ شہزادی ”اب بیٹھ بھی جا،“ وہ بیٹھ گیا

”مجھ سے نہیں تو اماں سے ہی بات کر کوئی،“ شہزاد پھر ہنسی

”اماں،“ دھلنا اسے یاد آیا۔ ہاں بیگم شہزاد کی ماں تھی۔ پھر اس کی نگاہوں میں وہ دن پھر گئے جب محلہ گوکل کا بن بنا ہوا تھا۔ سانوری کی نیم واں تھیں ڈول رہی تھیں اس کے ڈھلکے ہوئے شانے اس کی ترچھی نگاہ اور مرچیلی مسکراہٹ نیچے ارجمند چلا تھا۔ ”ہے ہے کیا شے ہیں یہ گوکل کے کنهیا جب سے آئے ہیں سارا محلہ پنگھٹ بن گیا ہے۔ ہے ہے اب میں کیا کروں۔“

پھر تھیڑ کی سٹیچ پر ریک اپنا سوٹا لہر ارہا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے گلری پر گلی ہوئی تھیں جہاں سانوری تخت پر جلوہ افروز تھی اور گلدم اور گلخیر و آہستہ آہستہ چلا رہے

تھے ابے دیکھ کر بے لیکن تینوں ہی گیلری کی طرف دیکھ رہے تھے۔

شہزاد کے والد غلام علی با نکے رنگیلے شخص تھے۔ عورت ان کی واحد کمزوری تھی لیکن علی احمد کی طرح وہ عورتوں کو گھر لانے کے عادی نہ تھے۔ وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے کہ عورت کو بیوی بنالینے سے شوق کی تسلیم نہیں ہوتی۔ وہ عورت کو محسوس کرتے اور اس کے حصول کی کوشش کرتے ان کے نزدیک حصول وقتی ملاپ کے مترادف تھا اور اسے دوام بخشنے کی چند اس ضرورت نہ تھی طبعاً وہ ایک ہخوار تھے۔ کل کلی کارس چونسا ادا کا شغل تھا۔ لیکن گھر میں پھولوں کے تختے لگانا انہیں پسند نہ تھا۔ گھر میں صرف ایک پھول تھا بیگم چونکہ غلام علی گھر کے معاملات میں دخل دینے کے قابل نہ تھے گھر پر بیگم کی حکومت تھی۔

یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ آیا بیگم طبعاً حکم تھی یا پرسوں کی حکومت کے بعد اس میں حکمرانی کا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔ بہر حال گھر کے معاملات میں وہ دخل اندازی گورا نہیں کرتی تھی۔ اور چاہتی تھی بلکہ اسے اپنا حق سمجھتی تھی کہ کوئی بات اس کی رضامندی کے بغیر واقعہ نہ ہو۔ وہ نوکروں، کام کرنے والوں اور حتیٰ کہ محلوں والوں پر حکم چلاتی تھی۔ دراصل اسے کسی محلے میں رہنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا چونکہ اس کا خاوند محکمہ ریل میں سیشن ماستر تھا اس لیے ساری عمر بیگم نے ریلوے سیشنوں کے کوارٹروں میں بسر کی تھی۔ جہاں اردو گردی خوانچے والے کارمندے اور بابو لوگ رہتے تھے جو سب غلام علی کے ماتحت کام کرتے تھے۔ لہذا بیگم ان سب کو اور ان کے متعلقین کو براہ راست اپنے ماتحت سمجھتی تھی۔ اس تفصیل کی وجہ سے اس کے انداز میں حکومت جاہریت اور نور جہانیت کے سے عناصر پیدا ہو چکے تھے۔

بیگم کو خاوند کی کمزوری کا علم تھا۔ اسے صرف ایک دکھ تھا کہ خاوند اس کے حکم سے کیوں باہر تھا اس بات پر اکثر گھر میں فساد ہوتا تھا لیکن غلام علی اپنی رنگیلی اور شوخ باتوں کے بل بوتے پر ٹال دیا کرتے۔

اس کے علاوہ چونکہ غلام علی کا جادو صرف ان عورتوں پر چلتا جن کی سماجی طور پر کوئی حیثیت نہ ہوتی تھی۔ اس لیے بیگم ان کی خوش فعلیوں پر حقارت کا انہار کرتیں اور خاوند کی ہر ایسی خوش فعلی پر بیگم کی اپنی حیثیت اور بھی بڑھ جاتی۔

ابتدۂ گھر کے ایک معاملے پر گھر میں غلام علی کی حکومت تھی۔ وہ منقوی اور لذیند غذا کھانے کے عادی تھے چونکہ ان کا خیال تھا کہ ایسے شوق کو پورا کرنے کے لیے غذا بے حد اہم چیز ہے۔ لہذا گھر میں کھانے سے متعلقہ کوئی بات ان کی رضامندی اور خواہش کے بغیر عمل میں رکھتی تھی۔ وہ بڑے اہتمام سے خصوصی غذا میں حاصل کرتے خصوصی اہتمام سے انہیں تیار کروائتے اولاد پھر جب وہ دستِ خوان پر بیٹھتے تو اہل خانہ پر ہوا کا عالم طاری ہو جاتا۔ سب کی نکایتیں غلام علی کے چہرے پر جنم جاتیں دل دھڑ کتے ہاتھ کا پتتے نہ جانے کیا ہوا گا۔

پہلا نوالہ منہ میں رکھنے کے بعد یا تو غلام علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکتی اس پر سب کے دل قائم ہو جاتے ہاتھ روائی ہو جاتے اور چہروں پر مسرت بھرا خیر پھیل جاتا۔ اور اگر غلام علی کے چہرے پر مسکراہٹ نہ آتی تو برتن دھم سے دیوار سے گلکراتے ”یہ کیا ہے لے جاؤ“ اور پھر گھر میں سنانا چھا جاتا۔

غلام علی کے شوق کو بیگم روک نہ سکی تھی اس نے پیار محبت سے سمجھایا۔ ٹوے بھائے و حملکیاں دیں کئی ایک عورتیں جنہوں نے غلام علی کے شوق کو پورا کیا تھا انہیں پیٹا بھی لیکن بات جوں کی توں قائم رہی۔ لہذا یہ بات بیگم کو گوارا کرنی ہی پڑی بھر حال بیگم ہی ہٹ کی پوری تھی۔ اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ غلام علی عورت کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا اور اکثر ایسے موقع آتے تھے جب غلام علی کو یاد آتا کہ بیگم بھی عورت ہے اس وقت بیگم خاوند سے تک بخشی کے ذریعے انتقام لیتی تھی۔ حیوان تڑپتا اور بیگم کو اس کا تڑپنا دیکھ کر لذت حاصل ہوتی وہ دہاڑتا چینتا چلاتا اور پھر باہر نکل جاتا اور دیوانہ وار عورت کو تلاش کرتا۔

ایک مرتبہ جب وہ ان حالات میں باہر نکلے تو پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی تھی۔ اور ڈبے سے ایک خاتون باہر نکل رہی تھی جو خود کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جس سے وہ بہت ساروپیہ بٹور سکتی ہو۔ وہ فیشن اسٹبل لباس میں مبوس تھی ہاتھ میں ہینڈ بیگ اور ماتھے تھے، انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کہا تو قرف انگریزی بولنے لگے۔ غلام علی بھائی میں ہٹکتے تیز تھے فوراً تاثر گئے کہ حالات ساز گاریں اگرچہ پہلے کبھی اس نوعیت کی عورت سے سابقہ نہیں پڑا تھا پھر بھی آخر عورت ہی تھی۔

ان کا مقصد تو محض ملابپ تھا۔ لہذا وہ اس کے پیچے پیچے چل پڑے اور چلتے چلاتے دنوں ڈامنگ روم میں پہنچ گئے۔

خاتون بڑی ہوشیار تھی اس کا مقصد ملابپ تھا۔ حسول زر کی خواہش بھی وقتی نہیں وہ دوام کی قائل تھی چونکہ ضرورت وقتی چیرنہیں۔ لہذا اس نے تنک بخشی کو کام لا کر غلام علی کی آگ میں تیل ڈال کر اسے بھڑ کا دیا۔

بیگم کو علم ہوا تو وہ جیجنی چلائی لیکن بیگم کو یہ علم نہ ہوا کہ غلام علی کے اس نئے تعلق میں دوام کا خطرہ ہے لہذا وہ جیجنی چلا کر خاموش ہو گئی۔

ادھر خاتون نے غلام علی کو پورے طور پر ہاتھ میں لے کر اسے صاف الفاظ میں کہدیا کہ اس نے یہ تعلق صرف اس لیے گوارا کیا تھا کہ اسے پہلی ہی نظر میں غلام علی سے محبت ہو گئی تھی محبت کا لفظ سن کر غلام علی سکتے میں رہ گئے۔ آج تک کبھی کسی عورت نے ان سے محبت کا اظہار نہ کیا تھا۔ اور ان کی اپنی بیوی تو بے رحمی کا انسپکٹر تھی۔ لہذا وہ خاتون کے سحر میں آگئے اور خاتون کے تحفظ سے متعلقہ تمام شرائط کو تسلیم کر کے انہوں نے خفیہ طور پر اس سے نکاح کر لیا۔ خاتون نے تحفظ کے طور پر بیگم کو طلاق دینے کا بھی مطالبہ کر دیا۔

جب بیگم کو معلوم ہوا تو وہ سنائے میں آگئی۔ اسے یقین نہ آتا تھا وہ سمجھتی تھی یہ محض دھمکی ہے یا ایک ناخوش کن خواب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دفتارے میں معزول کر دیا

جائے اور اس عمر میں تخت سے اتار دیا جائے جب کہ وہ چار جوان بچوں کی ماں تھی جن میں دو شادی شدہ تھے۔ لیکن جب طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں تھما یا گیا تو اس کے ہاتھوں کے طو طے اڑ گئے۔

اور اب وہ ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی شہزادے کے پاس آگئی تھی۔

بیگم نے ایلی کی طرف دیکھا گھورتے ہوئے کہا ”یہاں تھہرے گا کہاں“

شہزادہ نے لگی ”آ کر اپنے ہی گھر تھہرتا ہے نا انسان“

بیگم نے حیرت سے شہزادے کی طرف دیکھا

ایلی نے محسوس کیا کہ بیگم اٹھ کر ایلی کے کان پکڑا دے گی۔

بیگم کے اس روپ کے بعد شہزادے اپنی تمام تر توجہ ایلی کی طرف مبذول کر دی۔ وہ اٹھی میز کو جھاڑا نیا میز پوش لکالا اور پھر خود میز اٹھا کر ایلی کے سامنے لارکا۔

”تواب چائے لا کو جاؤ“ وہ بولی

”میں یہ کام کیے دیتی ہوں“ بیگم بولی ”تم کیوں خواہ مخواہ تمہاری طبیعت جو اچھی نہیں“

”اس کام کے لیے اچھی ہے“ شہزادہ جان بوجھ کر بیگم کو چڑھا رہی تھی

”مجھے تو سمجھ میں نہیں آتی تمہاری باتیں“ بیگم نے بصدھل کہا

”آ جائے گی سمجھ“ شہزادہ بولی ”آتنا ایلی تواب چائے بھی پیئے گا نہیں“

”ہوں“ ایلی بولا اس نے ان دونوں کی باتیں سنی ہی نہ تھیں۔ نہ جانے وہ کہاں کھویا ہوا تھا۔ شہزادہ نے ”اچھا تو یہ بات ہے اب یہاں پہنچ کر بھی کھوئے ہوئے ہو۔“

چند ہی روز میں بیگم اور ایلی ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے ایلی نے محسوس کیا کہ وہ پر رعب اور طمطراء بھری بیگم دراصل ایک ٹوٹی ہوئی گڑی یا ہے۔ اپنے گھر کی باتیں یاد کرتے ہوئے یا غلام علی کا کوئی قصہ سناتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ

جاتے ہیں انہیں روکنے کی کوشش میں خبطلوٹ جاتا ہے پھر بچوں کی طرح بلکہ بلک کروتی ہے۔

شہزاد کے گھر میں بیگم کی باتیں سننے والا کوئی نہ تھا۔ شہزاد کی دو بچیاں کھیل کو دیں گے رہتیں تیری بچی ابھی صرف دو ایک ماہ کی تھی۔ ان کے علاوہ جانو تھی جورہ وقت گھر کے کام میں لگی رہتی تھی محلے والیوں کے روپرواہی باتیں بیان کرنا بیگم کے وقار کے منانی تھے۔

شہزاد کی شاوی کے بعد علی اپور میں بیگم صرف دو تین مرتبہ آئی تھی۔ محلے پر وہ بھپتیاں اڑایا کرتی تھا کہ بھوپوں چڑھاتی تھی تھہارے کیا طریقے ہیں اور یہ یہاں کے لوگ کیسے ہیں، اس کے انداز میں فرشت کی جھلک نمایاں ہوتی لوہاں تھہارے خاوند کیسے ہیں ہئے میرے گھر میں کیا مجال ہے جو نمک ذرا زیادہ یا کم ہو اگر گوشت زیادہ گل گیا ہے یا ذرا کم گلا ہے تو بھی ہم میں یہ جرات نہیں ہوتی کہ اس اللہ کے ہندے کے سامنے رکھیں۔ بس سمجھ لوززلہ آ جاتا ہے برتن دھم سے دیوار سے ٹکر کر مکڑے ہو جاتے ہیں اور پھر ان کی آواز گوئیت ہے شوکت کی ماں یہ کیا ہے لا حول ولا قوہ تو بہے بہن خاوند کی بات سناتے ہوئے بیگم پر کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

بات بات پر اپنے گھر کی بات کرنا گھر میں اشیاء کی افراط کا تذکرہ کرنا اور پھر اپنے خاوند کے غصے اور بد بے کا اظہار کرنا بیگم کی عادت تھی اور صرف یہی نہیں غالباً وہ سمجھتی تھی کہ دوسروں کے لیے حقارت اور تفحیک کا اظہار نہ ہو تو اپنے گھر کی بات سنائی ہی نہیں جاسکتی۔ اب بھلا بیگم کس منہ سے ان محلے والیوں کو اپنی تفحیک کا قصہ سناتی کس طرح بتاتی کہ اس کی حکومت چھن چکی ہے۔ وہ معزول ہو چکی ہے۔ فی الحال یہ بات تو گھر کے چند ایک افراد کے درمیان سربستہ راز تھی اور محلے والیوں کے سامنے بیگم اسی انداز سے بات کرتی تھی جیسے اس کا گھر قائم ہوا اور اس کے میاں بدستور اس کے میاں ہوں۔

اہذا بیگم کے لیے محلہ والیوں سے بات کرنا ممکن نہ تھا۔ شہزادے بات کرتی تو وہ قہقہہ مار کر پتھری تھی۔ ”اماں پھر کیا ہوا۔ اسے بھی کر لینے دوڑے چند ایک سالانے فیشن کی بیوی ملی ہے ابا کو“ وہ پتھری۔

”ہائے اڑکی“ بیگم حیرت نے شہزادے کی طرف پڑھتی۔
شہزادے پھر قہقہہ لگاتی۔ ”اماں جو ہوا اب چھوڑو یہ قصہ تمہارے بال پچے ہیں۔ اتنے گھر تمہارے اپنے ہیں جس کے پاس جی چاہے رہو جو چاہئے کھاؤ پیو۔ پھر رونا کس بات کا اور پھر امال تھہاری عمر بھی اب پینتالیس کے قریب ہو گی اس عمر میں خاوند سے جدا ہی ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔“
دو ایک دن میں بیگم نے محبوس لے لیا کہ ایں وہاں صرف اس لیے موجود تھا کہ سارا دن اس کی باتیں سننے اور اظہار ہمدردی کرنے۔ اس میں شک نہیں کیا گی کو بیگم سے بے حد ہمدردی تھی لیکن وقت یہ تھا کہ جب بیگم اسے کوئی قصہ سناتی تو سنتے سنتے کسی لفظ یا اشارے کی وجہ سے ایسی کا خیال نہ جانے کہاں جا پہنچتا اور وہ بیگم اور جانو کے پاس بیٹھ کر خالی سر ہلاتا رہتا۔

پھر بیگم کی آپ بیتوں کے بعد ایک اور دور آیا اور بیگم اور ایسی مل کر عجیب و غریب مصروفیات میں کھو گئے۔ بیگم ایسی کو اشارہ کرتی کہ چلو میں آئی۔ وہ رابعہ کے خالی چوبارے میں جا بیٹھتا کچھ درپر کے بعد بیگم آ جاتی وہ سیاہ روئی سی تھیلے سے نکال کر کہتی ”اس نے کہا ہے اس روئی کی سات بتیاں بنا لو کوئے برتن میں موم کی پتلی بنا کر رکھ دو پھر اس بتی کو آگ لگا کر اس برتن میں ڈال دو لیکن اس طریق سے ڈالو کہ بتی بجھے نہیں۔ اور جب تک برتن سے دھواں نکلتا رہے ایک ناگ پر کھڑی ہو کر آئی بلا کو ڈال تو“ پڑھتی رہو۔

”یہ عامل سمجھدار بھی دکھتا ہے یا نہیں“ ایسی پوچھتا
”بڑا سیاہا ہے“ بیگم جواب دیتی ”ہزاروں کے گھر آباد کر دیئے اس نے“

”پھر تو بہت اچھا ہے“، ایلی کہتا
”بس ایک ہی مشکل ہے“
”وہ کیا؟“

”میں ایک ناگ پر کسے کھڑی ہو سکوں گی اتنی دیر کے لیے“
”لواس میں لیا ہے ہاتھ سے کرسی کو تھامے رکھنا“
”ہاں“ وہ مسکراتی ”یہ ٹھیک ہے“

”کہا تو میں سہارا دیسی رہوں“ ایلی سے ہمدردی جاتا تا

وہ غصے سے ایلی کی طرف دیکھتی۔ بیگم کو ہر ایکی بات بری گئی تھی جس سے قرب کا احساس ہوا یا بے تکلفی کا اطمینان ہوا۔ اس کی وذفات میں بے تکلفی جنس تعلق کی دلیل تھی۔ اور جنسی تعلق کے لیے بیگم کے دل میں نفرت کے جذبات قائم ہو چکے تھے۔
بیگم عامل کے دینے ہوئے تعریز لے آتی اور وہ دونوں بیٹھ کر انہیں پانی میں گھولتے رہتے۔

ان عملیات کے بعد وہ ان کے نتائج کا انتظار کرتے۔ ایلی کو تو حیران عملیات پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ وہ جاؤ و سحر تعریز یا اس قسم کی دوسری چیزوں کے اثر سے قطعی طور پر منکر تھا۔ البتہ بیگم کی تسلی کے لیے وہ کہا کرتا تھا ”ہاں ان چیزوں کا اثر ہوتا ہے“، لیکن شہزادوں بے با کانہ ان باتوں کا مذاق اڑایا کرتی۔

دو پھر کے وقت دروازہ بیٹھتا تو وہ جانو سے کہتی ”جامیر امنہ کیا دیکھ رہی ہے نیچے ڈاکیہ رجسٹری لایا ہے۔“

”رجسٹری“ جانو حیرت سے پوچھتی
”کیا مطلب“ ایلی دریافت کرتا

پھر وہ نہایت سنجیدگی سے جواب دیتی ”اماں کا عمل جو ختم ہو گیا ہے اب ابا کی طرف سے اطلاع تو آئے گی ہی کوہ قصہ ختم ہو گیا ہے اب گھر آ جاؤ کیوں اماں“

یا جب بیگم اور ایلی بھی جلانے میں مصروف ہوتے تو وہ نہایت سنجیدگی سے پوچھتی ”اماں یہ موم کی پتلی تم ہو یا ہماری سوتلی“، اس طرح وہ اکثر مذاق ہی مذاق میں ماں کے ان عملیات کا مضمکہ اڑایا کرتی۔ کثراں کی باتیں ذو معنی ہوتیں اور ایلی انہیں سن کو چونکتا۔

مثلاً پہلے روز ہی اس نے بیگم سے کہا تھا ”اماں چھوڑو ان عملیات کو بھلا بتیاں جلانے سے کیا ہوتا ہے، اگر یہ عمل پر اثر ہوتے تو میں تعریز کے زور پر کسی کو اپنانہ بنائیں“، شہزاد نے ایلی کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کے ماتحتے کائل بے حد شوخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں مایوسی اور حسرت بھری تمنا کی تھی۔

پھر ایک روشنہزاد کے سامنے روانی و ناچار لرزی بیگم نے پوچھا تھا ”روانی کیا کرے گی تو“ اور اس نے جواب دیا تھا ”میں بھی بیان بناؤں گی“ کیوں تمہیں کیا ہے؟ ماں نے پوچھا تھا اور اس نے جواب دیا تھا ”بہت کچھ ہے اوپر سے نہیں وکھتا شاید بتیاں جلانے سے میرا بھی ساتھی واپس آجائے“ اور ساتھ ہی اس نے بڑی جرات اور بے باکی سے ایلی کی طرف دیکھا تھا ”کیوں ایلی؟“ اس نے کہا تھا ”جانے والے واپس بھی آ سکتے ہیں کیا“ اور پھر یوں نہستی تھی جیسے آگیکہ کسی ان جانے دباو سے چور چور ہو گیا ہو۔

شہزاد کو بیگم کے ان عملیات اور اس کے قصے کہانیوں کے خلاف سخت شکایات تھیں چونکہ ان مصروفیات کی وجہ سے ایلی اس سے دور ہو گیا تھا۔ شہزاد کو ایلی کے قرب میں چند اس دلچسپی نہ تھی بلکہ عام طور پر وہ ایلی کے قرب سے گھبرا جاتی تھی لیکن اس کی خواہش تھی کہ ایلی کے دل میں شہزاد کی آرزو کم نہ ہو جائے۔ وہ اسے ملنے کی آرزو چاہئے بیٹھا رہے۔ تہائی کے لمحات کی آرزو کرے عملی طور پر کوشش کرے تہائی میں اس سے ملے اس کے لئکے بازو کو اسی طرح تھامے جیسے ڈوبتے کے لیے تنگا ہو۔ اس کے پاؤں کو اپنی نگاہوں سے گھیرے رکھے۔ دور بیٹھ کر دیوانہ اور اس کی طرف دیکھتا

ہے۔

لیکن اب کی بار جب سے ایلی علی پور آیا تھا وہ ان سب باتوں سے یوں بے نیاز ہو چکا ہو چیسے وہ وہ ایلی ہی نہ ہو۔ الشادہ چھوٹے سے چھوٹے موقع پر بیگم کو ساتھ لے کر رابعہ کے چوبارے میں جائی چھتا اور بیگم کی باتوں میں مصروف ہو جاتا۔ یہ دیکھ کر شہزاد بار بار بہانے بہانے چوبارے میں آتی ایلی کے قریب تر آکھڑی ہوتی چوری چوری اس کامنہ سہلا تی۔ چکلیاں بھرتی اور باتوں ہی باتوں میں بہت کچھ کہہ جاتی۔

فلیگ سٹیشن

ایلی کی بظاہر بے نیازی نے شہزاد کے شوق کو بھر کا دیا تھا۔ یہ شہزاد کی پرانی عادت تھی۔ اس کے پیچے پیچے پھر توہہ آگے کی سمت بھائی تھی اس سے دور ہٹوڑوہ تعاقب کرتی تھی حتیٰ کہ دور ہٹنے والا اس کے پیچے پیچے چل پڑتا اور پھر وہ دفعتاً بے نیاز ہو جاتی۔

ایک روز جب بیگم کسی عامل کے ہاں گئی ہوئی تھی جانوئی خپل باور پی خانے میں مصروف تھی اور ایلی چپ چاپ چوبارے میں بیٹھا ہوا تھا۔ تو شہزاد نے چکپے سے آ کر اس کی آنکھیں بند کر لیں اس سے پہلے ایسے حالات میں وہ جھٹکھنے کی طرح بجھنے لگتا اس کی نس نس میں گویا بھڑوں کا جھٹکہ جھنمہ نے لگتا تھا اور وہ دیوانہ وار اس کے ہاتھوں کو چومنا شروع کر دیتا تھا لیکن اس روز وہ چپ چاپ بیٹھا رہا اور پھر کہنے لگا ”شہزاد ہے“

اس پر شہزاد بھی ہاتھاٹھا کر کہنے لگی ”چلو آخر ایک نا ایک دن جانے والے نے جانا ہی تھا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بولا
”میں پہلے ہی جانتی تھی،“ وہ بھی اس کی بھی میں شکست کی آواز تھی
”کیا؟“ ایلی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا

”جانتی تھی کہ اپنی حیثیت تو فلیگ شیشن کے برادر ہے۔ یہ گاڑی جو رکی ہے چند روز بڑھ رہے گی۔“

”تم تو ریلوے بابو کی طرح بات کر رہی ہو،“ ایلی نے کہا

”بابو کے گھروالی جو ہوئی، وہ نہیں۔“
ایلی ہنسنے لگا۔ ”تم میں میاد ہے پچھلی مرتبہ میں کن حالات میں میں یہاں سے رخصت ہوا تھا۔“

”یاد ہے، وہ بولی“ لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ یہ سب کچھ اس کی وجہ سے نہیں ہے۔“

”یہ کیا ہے؟“

”جو کچھ بھی ہے۔“ 2002-2006 © All rights reserved by www.QuranUrdu.com

”اس کی وجہ سنوگی“ ایلی نے شرارت سے اس کی طرف دیکھا
”سن لوں گی لیکن“

”لیکن کیا“

”لیکن کوچھوڑ و تم سناؤ“

”تم نوازنا جانتی ہو شہزادجسے تم نے نوازا کبھی لو وہ خود سے گیا“

”اچھا“

”لیکن تمہارا کھیل کر کھلونے کو پھینک دینا بڑا افیت ناک ہے۔“

”مطلوب ہے کہ میں نے پھینک دیا ہے۔“

”یہ تو قعی پھینکنا تھا و قعی پھینکنا اس قدر خوفناک تو“

”اس ڈر کے مارے تم چلے گئے تھے۔“

”اس غصے کے مارے کہ تمہارا ایک حصہ الگ تھلگ رہتا ہے بے پروا بے نیاز اور وہ حصہ کسی وقت بھی تم پر مسلط ہو سکتا ہے۔“

”تو اس ایک حصے کو سزا دے رہے ہو“ وہ نہیں

”اونہوں بے پروا بے نیاز کو کون سزا دے سکتا ہے سزا تو صرف اسے دی جا سکتی ہے جو پروا کرتا ہو جسے لگن ہو لگا وہ ہو“

”تو مطلب یہ ہے کہ ایک حصے کے قصور پر وسرے کو سزا مل رہی ہے“ وہ ہنسنے لگی۔

”بہر حال“ وہ بولی ”گاڑی فلیگ سٹیشن سے نکل گئی“ پھر اس نے از خود اپنا بازو اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”مجھے کوئی شکایت نہیں“ وہ ہنسنے لگی ”ہونی ہو کر رہتی ہے۔ لیکن وہ بولی“ یہ سب باقیں جو تم سنارہے ہو محض زانیں ہیں وہ سمجھدہ ہو کر بولی ”ایک روز میں نے تمہیں ایک کہانی سنائی تھی معلوم ہوتا ہے وہ کہاں اب تھام ہو رہی ہے۔“ اس نے آہ بھری ”اور یہ کہانیاں جو تم مجھے سنارہے ہو محض قہے ہیں سنانے کے قصے تم نا راض اس لیے ہوتے تھے کہ تم مجھ پر شک کرتے تھے تم سمجھتے تھے کہ میں ہر کسی سے آنکھیں لڑاتی پھرتی ہوں۔ اس روز تم اسی لے چلے گئے۔ لیکن یہ تمہاری آج کی نگاہ نہ تو اس شک کی وجہ سے ہے اور نہ غصے کی وجہ سے یہ تو“ وہ رک گئی ”یہ تو کیا؟“

”یہ تو گاڑی فلیگ سٹیشن سے نکل گئی اور بس“ وہ مسکراتی

”کیا مطلب“ ایلی نے ترک پر کر شہزادی طرف دیکھا

شہزاد کے گالوں پر دو آنسو ڈھلک رہے تھے ”اچھا کیا“ وہ بولی ”بہت اچھا ہوا یہاں دھراہی کیا تھا۔ جو تمہاری بھیث کیا جاتا۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ زندگی میں تم سے ملا ہو گا تو میں تمہاری بھیث کرنے کے لیے اپنا سب کچھ امانت رکھتی“ اس نے آنسو پوچھے اور دفعتاً کہنے لگی ”میرا ہاتھ تو تمام لوگم از کم چلو دھوکہ ہی سہی۔ اب میں خود کو دھوکہ دے کر بھی دیکھ رہی ہوں اس میں میری مدد کروں۔“

شہزاد نے ایک عجیب سی نگاہ ایلی پر ڈالی۔ ایلی نے زبردست دھچکا سامحسوس کیا وہ

گر رہا تھا اگر اجارہ تھا۔

ایلی کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ تھی کہ اس پر ہمیشہ شدید خوف غالب رہتا تھا کہ اسے بے وقار نہ سمجھا جائے۔

ہوں یا محبت

علیٰ احمد کے گھر میں پروپریٹی پانے کی وجہ سے چند ایک باتیں اس کے دل میں گھر کر گئی تھیں اور اس قدر جڑ پکڑ پکی تھیں کہ انہیں دل سے نکالنا ناممکن ہو چکا تھا۔ وہ ان باتوں پر اس حد تک یقین رکھتا تھا کہ وہ اس کی شخصیت کی بنیاد پر بن چکی تھیں۔ یہ باتیں تجربے دلیل عقل یا شعور سے اخذ نہیں کی گئی تھیں۔ بلکہ اس کے دل کے گھرے ترین جذبات ان کا فوج تھے۔

ایلی سمجھتا تھا کہ محبت صرف ایک محبوب سے ہو سکتی ہے اور مقصود شادی نہ ہو تو وہ محبت نہیں ہوتی۔ اس کے ذہن میں کسی سے محبت لگا کر بے وقاری کرنا شدید ترین گناہ تھا اس کا ایمان تھا کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت نہیں ہوئی چاہیے۔ عورت کو مکمل آزادی ہوئی چاہیے اس سے ایسا سلوک روانہیں رکھنا چاہیے جس میں اقتیاز کا غصر ہوا سے بھیڑ کبری یا غلام نہیں سمجھنا چاہیے۔

یہ سب خیالات اس نے علیٰ احمد ہا جرہ اور اپنی زندگی سے اخذ کیے تھے۔

اس نے اپنے باپ کی جسمی بے راہ روی کی وجہ سے بہت دکھ سہا تھا۔ اپنی والدہ کی مظلومیت کی وجہ سے اس کا بچپن تباہ حالی میں گزرا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ اس محبت سے محروم رہا تھا جس کے بغیر بچے کی شخصیت پھل پھول نہیں سکتی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے شہزادے محبت ہے تو پھر سادی سے کیا ہے اسے سادی سے تنہائی میں ملنے کے کئی ایک موقع ملے تھے۔ گھنٹوں وہ اس کے پاس کھڑا رہا تھا لیکن اس نے کبھی کوئی خصوصی خواہش محسوس نہ کی تھی۔ اسے سادی سے مل کر ایک ان جانی خوشی ہوتی تھی اس کا خط پڑھ کر وہ مسرت کی ایک روح محسوس کرتا تھا۔

اگر اسے سادی سے محبت ہے تو پھر شہزادے کیا تھا۔ کیا اس روز جب وہ کہانی سن رہی تھی۔ اور ایلی نے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے اس کا ارادہ ہوں کاری پر بنی تھا۔ اس وقت اس کی نس نس میں دھنکی سی کیوں بھی تھی جب وہ شہزادہ کا ہاتھ پکڑتا تھا تو اس کے جسم میں چیزوں نیاں سی کیوں چلنے لگتی تھیں کیوں اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے قریب تر ہو جائے اور قریب اور قریب !! کیا یہ ہوش تھی کیا جسمانی قرب کی خواہش ہوں ہوتی ہے۔

لیکن محبت میں آرزو و ضرور ہوتی ہے۔ قرب کی آرزو ہوتی ہو تو کیا ہو سکتی ہے۔ اسے کچھ سمجھنیں آتا تھا۔ یہ درست تھا کہ سادی کیس تھا اس نے جسمانی قرب کی خواہش محسوس نہ کی تھی سادی کی موجودگی میں ایک لطیف سائز اس کی نس نس پر چھا جاتا تھا۔ لیکن شہزادے کے لیے وہ تنہائی کی آرزو کرتا تھا اور تنہائی میسر ہوتی تو اس کا جی چاہتا اس کے قریب تر ہو جائے۔ اگر شہزادا یے موقعے پر بے پرواہ ہو جایا کرتی تو نہ جانے اس قریب کا نتیجہ کیا لگتا۔ بہر حال وہ نتیجہ اسے قطعی طور پر گوارانہ تھا۔ جو اس روز بند بیٹھک میں ہوا تھا اس کی ایلی نے آرزو نہ کی تھی بلکہ اس نے وہ قدم صرف اس لیے اٹھایا تھا کہ اس کو یقین تھا کہ اگر عورت سے منہ زبانی محبت کی جائے تو وہ اکتا جاتی ہے۔

بہر حال جہاں تک اس کے اپنے چدیات کا تعلق تھا وہ دل کی گہرائیوں میں سادی کی محبت کو بہتر سمجھتا تھا چونکہ اس میں گناہ کا عنصر شامل نہ تھا سادی کسی کی بیباہتا بیوی نہ تھی اس کے علاوہ اسے شہزادہ پر اعتماد نہ تھا نہ جانے کیوں وہ سمجھتا تھا محلے کے تمام جوان اس کے عشق میں سرشار تھے اور شہزادہ قدرتا محبت بھری نگاہوں کے سحر سے خود کو محفوظ کرنے کی خواہ شمند نہ تھی۔ چاہے وہ نگاہیں کسی کی بھی ہوں۔

شہزادہ کا حسن اس کے دل میں احساس رقابت پیدا کرتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ ساری دنیا اس کی رقیب ہے اور وہ شہزادہ کے نقاب کے ابھرے تاروں کو گلزار رہتا لیکن شاید

یہی محبت کا ثبوت ہو۔ بہر حال یا حساس اس قدر راذیت وہ تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ اس سے نجات حاصل کرے۔

وہ چوری چوری دعائیں مانگتا تھا کہ ساوی کی بات میں مشکلات حائل نہ ہو جائیں ساوی اس کی ہو جائے اور اس کی زندگی سے وہ خوف، رقابت اور حساس گناہ خارج ہو جائے جو شہزادی کی محبت سے وابستہ تھا لیکن اس میں اس قدر جرأت نہ تھی کہ اعلانیہ اس آرزو کو اپنالے کیونکہ وہ ڈرتا تھا کہ اسے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ وہ شہزادے بے وقاری کر رہا ہے اور یہ بات اسے کسی صورت میں گوارا نہیں۔

جب سے ایلی لاہور سے آیا تھا اس نے شہزادی طرف سے خصوصی توجہ نہ دی تھی۔ اس نے اس کا لکھتا ہوا باز و پکڑنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس نے غور نہ کیا تھا کہ اس کے ماتھے کائل کب سیاہ پر گیا اور کب مرغی مائل اس نے شہزادے کے جسم کی خوبیوں کی اس شدت سے محسوس نہ کیا تھا۔ اپنی اس تبدیلی اس بے رثی کا جواز یہ پیدا کیا تھا کہ وہ شہزادے ناراض ہے چونکہ پچھلی مرتبہ جب وہ علی پور آیا تھا تو شہزادے اس سے بے پرواںی کا سلوک کیا تھا۔

بہر حال اندر وہی طور پر وہ ایک شدید کشمکش میں بٹلا تھا اس میں اس قدر جرأت نہ تھی کہ شوری طور پر فیصلہ کرتا کہ آیا اسے ساوی سے محبت تھی یا شہزادے یا بیک وقت دونوں سے

دو یوتا

اگر شہزادہ ایک عام عورت ہوتی تو وہ ایلی کو یوں بے پرواں کیجھ کر بے زار ہو جاتی شہزادے کے لیے ایلی بد نامی کے ٹیکے کے سوا اور کیا تھا۔ ایلی کی وجہ سے محلے والیاں اسے طعنہ دیا کرتی تھیں۔ ہاجره اور فرحت سمجھتی تھیں کہ شہزادے نے جادو کے زور پر ایلی کو طوطا بنا کر اپنی انگلی پر بٹھا رکھا ہے حتیٰ کہ اس کا خاوند اس سے بدظن ہوا جا رہا تھا۔ اس کی اپنی والدہ شکوہ سے بھری ہوئی تھی لیکن مجبور تھی۔ شہزادے کے تیور دیکھ کر خاموش

ہورہتی بذات خود ایلی ہر روز شہزادے ایک نیا جھگڑا کھڑا کر لیتا تھا تم نے فلاں کی طرف کیوں دیکھا تھا۔ تم میرے پاس بیٹھنے سے گرینز کیوں کرتی ہو۔ سارا دون ایلی کے سامنے چڑھاوے چڑھتے رہتے۔ نئی نئی چیزیں پا کر اس کے سامنے رکھی جاتیں جیسے گھر میں دیوتا بھوار کھا ہو۔

شہزاد کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ وہ دیوتا سامنے بیٹھا رہے۔ نہ تو اس کے آگے بھکشا کے لیے با تھوپ کھیلانے اور نہ ہی اسکے کہیں جائے لیکن اس کی پریم مرلیا مہر گیت بجائی رہے۔ دراصل شہزاد افطری طور پر ان کی عورت تھی اسے جسم سے لاگ تھی اسے اپنے گردھب کا بالہ قائم رکھنے کا جونون تھا وہ پنچھٹ کی پیاری تھی لیکن گلری بھرنے سے اسے یہ تھا اور جسمانی قرب کو صرف اسی صورت میں برداشت کرنے کے لیے تیار تھی جب پریم کے دیپ کو جلتا رکھنے کے لیے اس میں تیل ڈالنا ازبس ضروری ہو جائے۔

ایلی کی بے پرواںی کو محسوس کر کے شہزاد یوں تڑپنے لگی جیسے مچھلی جل بناتی پتی ہے۔ پریم کا دیپ بھتھا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں، ہاتھوں، ہونٹوں اور انگ انگ سے تیل کی بوondیں ٹپک رہی تھیں۔ دیوتا کو منانے کے لیے ناری اپنی بھیث کے لیے کھڑی تھی۔

ایلی کو ابھی تک یہ علم نہ تھا کہ عشق میں ازلی طور پر خود کشی کا غصر ہوتا ہے۔ عشق بذات خود عاشق کو محبوب کے وصال سے محروم کر دیتا ہے۔ اسے علم نہ تھا کہ محبت محبوب کا حصہ ہے عاشق کا نہیں اور اگر کسی کی محبت حاصل کرنا مقصود ہو تو اسے محبوب بننے کی کوشش کرنا چاہیے نہ کہ عاشق اور بے نیازی محبوب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ ساوی کے خیال میں کھو کر وہ شہزاد کا محبوب بن گیا اور ناری کی تمام قوتیں اس بات پر تل گئی تھیں کہ ایلی کی محبت کا دیپ جلا کر اسے وہی پرانی حیثیت بخش دی جائے اور پھر شہزاد شہزاد بن کرو ہی پرانا بے نیازی کا روپ دھارے

اور پھولداروں پر لے کر قتلی سی اور ادھراڑتی پھرے۔

یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ بیگم اس وقت علی پورا آئی تھی جب شہزاد اور ایلی نے اپنے روں بدل لیے تھے۔ اور ایلی کی حیثیت محبوب کی بن چکی تھی۔

اگر وہ اپنے آتی تو ممکن ہے وہ صحیح کہ ایلی شہزاد کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے اور شہزاد اسے دھکاری نہیں لیکن وہ دیکھ رہی تھی کہ شہزاد ہاتھ پھیلا رہی ہے اور ایلی دیوتا سامنے بے نیاز بیٹھا ہے۔ لہذا اس نے محسوس کیا شہزاد غلام علی ہے اور ایلی ایک بیج عورت جو خریدی جا سکتی ہوئی تھی یہ ہوا کہ بیگم کے دل میں شہزاد کے لیے وہی جذبات پیدا ہو گئے جو غلام علی سے وہ بستہ تھے۔ نفرت اور تھارت کا یہ طوفان چونکہ چلنے سکتا تھا لہذا اس کے دل کی گمراہیوں میں اکٹھا ہوتا کیا اور اس کے اٹھا ہونے کی وجہ سے شہزاد اور ایلی کا مستقبل تاریک ہوتا گیا۔

سب سے پہلے بیگم نے اس کا اظہار جانو کے سامنے کیا۔

جانو نے اپنی تمام تر زندگی تیاگ کے تحت بسر کی تھی۔ وہ جوانی میں خوش شکل تھی اور جوانی ہی میں اس کا خاوند مر چکا تھا اور اس نے اپنی تمام تر زندگی لوگوں کے کام کاچ کرنے اور اپنی عصمت کے تحفظ میں بسر کی تھی بیگم کی بات سن کرو اور آتش فشاں پھٹ گیا۔

”اے ہے، جانوبولی“ بیگم یہاں تو آئے دن یہی کچھ ہوتا ہے اب رانی سے کون کہے کہاپنا آپ سنجال؟“

”آخر بیٹھی کس کی ہے،“ بیگم کے دل میں غلام علی بسا ہوا تھا۔

”بیٹی تو تمہاری ہی ہے،“ جانوبولی

”ہائے میری ہوتی تو یہ چلن نہ ہوتے“

”اور وہ شریف میاں بدھو،“ جانوبولی ”وہ سب کچھ دیکھ کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا ویسے نام کو خاوند ہے۔“

”ہوں خاوند“ بیگم نے کہا ”اس محلے کے کاؤنڈلوں نہ جانے کس مٹی سے بننے ہوئے ہیں خاوندوں والی بات ہی نہیں“ بیگم کے نزدیک تو صرف ایک خاوند ایسا تھا جو خاوند کہلانے کا مستحق تھا۔ اس نے بیگم کو گھر سے نکال کر ازالی محبوب کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

بیگم اور جانوکی یہ دلی دلی باتیں ابھریں اور پھر اس پر اسرار اصول کے ماتحت باہر نکل گئیں جسے آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔

محلے والے جوانی اور شہزادے کے قصے پر اظہار خیال کرتے کرتے آتا گئے تھے، ایک بار پھر جوش میں آگئے اور تازہ و مر ہو کر اس پی ہوئی لکیر کو پینے لگے۔ ایلی یہ حالات دیکھ کر اور ابھی کھبر لگایا۔

محبت نامہ

ایک روز جب وہ سب چو بارے میں بیٹھے تھے۔ ایلی آلتی پالتی مارے دیوتا بنا بیٹھا تھا شہزادے کے ہاتھوں میں پوچا کے پھول تھے اور وہ نفس نشیں آرتی بی ہوئی تھی۔

بیگم کے دل سے شعلے نکل رہے تھے جانوکے ہونٹوں پر تحریر تھی تو دروازہ بجا ”جاد کیجھ جا کر“ شہزاد جانو سے مخاطب ہوئی ”نیچے ڈا کیہ کب سے محبت نامہ لیے کھڑا ہے“ وہ حسب معمول مسکراتی

”محبت نامہ“ بیگم نے حیرت سے پوچھا

”ہاں ہاں وہ کہتے ہیں جا وہ برحق ہے“

دوسری مرتبہ دروازہ بجا تو جانو نیچے اتر گئی

شہزاد ہنسنے لگی ”اماں اگر آج بھی محبت نامہ موصول نہ ہوا تو پھر چوڑوان تعوز گندوں کو“

”کیسے چھوڑوں“ بیگم بولی ”جس کاراج پاٹ لٹ گیا“ وہ رک گئی اس کی آنکھیں ڈبلڈ بایا چکی تھیں۔

شہزاد پھر فسی ”تو اماں راج پاٹ کے لیے روئی ہونا میں صحیحی پتی بھلکی کے لیے روہی ہو“

”جس پر بیتے وہی جانے ہے“ بیگم نے کہا
”مجھ پر بیتے تو میں سمجھوں خس کمک جہاں پاک، شہزاد نے معنی خیر نگاہ ایلی پر
ڈالی

”تیری نظر میں کوئی ہوگا“ بیگم نے ایلی پر جلی کٹی نگاہ ڈالی
شہزاد نے قہقہہ لکایا ”ہاں ہے“ وہ بوی ”نہ بھی ہوتا جب بھی یہی صحیحی“
جانو آئی تو اس کے یادخیں خط تھا
”دیکھانا میں نے کہا تھا“ شہزاد بولی
”تمہارا ہی محبت نامہ ہوگا“ بیگم بولی

”مجھے کون لکھتا ہے جی اور پھر محبت نامہ“ وہ قہقہہ مار کر فسی ”محبت نامے“ میں
زیادہ سے زیادہ یہ لکھا ہوتا ہے کہ روئی کی تکلیف ہے۔ ان کا تو صرف روئی کا مطالبہ
ہے کھائی اور آنکھیں مومند لیں۔ انہیں محبت سے کیا واسطہ

”یہ تو میرا ہے“ ایلی نے کہا
”شاپید غلطی سے تمہارا نام لکھ دیا ہو کھولو تو“ شہزاد بولی
ایلی نے اسے کھولا تو وہ بھوچ گارہ گیا وہ سادی کا خط تھا
جانو چلا می ہے ”یہ کیا خط ہے یہ تو اخبار معلوم ہوتا ہے“
”اور کیا محبت کی بات مختصر ہوتی ہے کیا“ شہزاد بولی
ایلی کارنگ فق ہو گیا

”اوہ جس کا نام آیا ہے اس سے پوچھو وہ تو پیاسا ہی رہ جاتا ہے“ شہزاد مسکرائی
ایلی نے محسوس کیا جیسے شہزادی سادی کے تمام قصے سے والق ہو
”یہ کالج کے متعلق ہے“ ایلی کہنے لگا

”جبھی خط نہیں دفتر ہے“، جانوبولی

ایلی خط اٹھا کر ایک طرف چلا گیا

ساڈی کا خط پڑھ کر ایلی ایک مرتبہ پھر اسی فضائی میں پہنچ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ زینے والے کمرے میں کھڑا ہو اور ساڈی مسکرا رہی ہو مسکرائے جا رہی ہو سارے خط میں محبت کا تو کہیں نام ہی نہ تھا۔ وہ خود بہتی تھی اور ایلی کو گدگداتی تھی۔ اور بھانے بھانے لگا کہ کی بات سمجھاتی تھی۔

ایلی نے وہ خط کئی ایک مرتبہ پڑھا اور وہ قطعی طور پر بھول گیا کہ وہ علی اپر میں ہے اور دیتنا سامنے آتی پاتی مارے بیٹھا ہے سامنے آرتی پڑکی ہے اپجا کے بھول بکھرے ہوئے ہیں ڈیکم نے غصے بھرا طوقان اندر ہاہے محلے میں لوگ ہونٹوں پر انگلیاں رکھے بیٹھے ہیں۔

اس روز پہلی مرتبہ وہ باہر نکل گیا

محلے سے وہ جلدی جلدی نکل گیا تا کہ کوئی بات نچھیرے پھر کھیتوں میں پہنچ کروہ کوٹی کی طرف چلا گیا۔

اس کے سامنے ساڈی کھڑی مسکرا رہی تھی ”خط کا جواب کیوں دیں گے آپ“ وہ کہہ رہی تھی ان پیسوں کا بالائی برف کھائیے نہیں تو پتلون رفو کرا لجھے وہ اپنے لکھے ہوئے جملہ دہرا رہی تھی۔

دوسری طرف منصر کھڑا کہہ رہا تھا ” وعدہ کیجئے کہ آپ ان لوگوں سے براہ راست رابطہ پیدا نہ کریں گے“، تیسری طرف امان بندوق اٹھائے اس کی جانب آ رہا تھا اماں ہاتھ مل رہتی تھی۔ ہئے اب کیا ہوگا۔

ساڈی کے خط میں دو باتیں امید افزاتھیں۔ اس نے لکھا تھا کہ جلد ہی کوئی صاحب علی اپر آئیں گے تا کہ ایلی اور ۲ صفحی خاندان کے متعلق تحقیق کریں۔ کرتے پھریں تحقیق ہمیں کیا دوسرے اس نے خط میں پتہ لکھا تھا اور مطالباً کیا تھا کہ جواب

ضرور دیا جائے۔ اور اس پتہ پر دیا جائے اور اس کی راست گولی کا مسحکہ اڑایا تھا۔
جس سے ظاہر تھا کہ معاملہ کو رکھنا ضروری ہے۔

دیر تک ایلی بیٹھ کر اس کے خط کو ذہن میں وہ راتا رہا پھر وہ اس کا جواب سوچنے
میں منہمک ہو گیا۔ والپی پر ایلی کو خیال آیا کہ کیوں نہ رضا سے مل لوں۔ وہ اپنی بے
اعتنائی پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ رضا کی دوکان بندھی اس لیے وہ اس کے گھر چلا
گیا۔ ایلی کو گھر کے دروازے پر دیکھ کر رضا کی حیرت کی انتہاء رہی۔

”تم یہاں وہ چلایا فیکار ہے خوش نصیب ہو جو گھر آئے ورنہ آج ہی میں نے
برداخت نہ کا فیصلہ کیا تھا۔“

”کیا؟“ ایلی نے پوچھا
”اب بتانے کا کیا فائدہ تم آگئے ہو تو چلو معاف کرو یا“ وہ ہنسنے لگا ”آج ڈیکھو اندر
آجائے تمہیں ایک خبر سناؤں“

”کیا؟“ ایلی نے پوچھا

”شاوی ہو رہی ہے“

”کس کی؟“

”اپنی اور کس کی؟“

”تمہاری؟“ ایلی نے حیرت سے اس کی لنگڑی ناگ کی طرف دیکھا۔

”بھی شادی کو لنگڑے پن سے کیا تعلق،“ رضا نے قہقہہ مار کر کہا ”بلکہ لنگڑے کی
پکڑ تو مشہور ہے۔“

”تعجب کی بات ہے،“ ایلی بولا

”بھی اپنا اللہ مالک ہے آج تک بھی روزی پہنچتی رہی ہے اب مستقل صورت
پیدا ہو جائے گی۔“

اس کے بعد ایلی کا معمول ہو گیا کہ وہ روز کسی نہ کسی وقت رضا کو ملنے چلا جاتا۔ اور

وہ دونوں یا تو دکان میں بیٹھے رہتے یا شیخ ہدم کے ہاں چلے جاتے۔
شیخ ہدم اسے دیکھ کر شور مچا دیتا۔

”لو بھی اب تو چھوڑ و بھاؤ تا تو ہمارے مہمان آئے ہیں اب تو سووا ہو گیا سائز ہے
وہ آنے پر بس ہاں تو الیاس صاحب آئے ہیں آئیے کیا پیو گے بھی ہم سے بھی کچھ
کھاپی لیا کرو حلال کمال کھاؤ گے تو موٹے ہو جاؤ گے چلو ایک شترنج کی بازی
رہے اور اس کے دینا ہمیں شترنج“،
ہدم کے ساتھ شترنج کھیلتے ہوئے ایلی سب کچھ بھول جاتا کہ وہ دیوتا بنا بیٹھا
ہے۔ سامنے شہزادہ اُرتنی کے پھول اٹھائے گھڑی ہے اور محلے والے اس دیوتا کو
شیطان سمجھتے ہیں۔ اور الہا ہور سے لوگ اُرتبے ہیں اور اسے علی احمد کو اس بات پر رضا
مند کرنا ہے کہ با قاعدہ طور پر پیغام لے کر جائے اور منظر سے ملے۔

ایلی بڑا ہو گیا تھا۔ لہذا کچھ حوالی یا محلے کے میدان میں کھڑا ہونا یا کھلینا اس کے
لیے مشکل ہو گیا تھا۔ کچھ حوالی اور میدان میں نئی پودے جگہ لے لی تھی۔ اب یہ ممکن
نہ رہا تھا چونکہ یہ محلے کی روایات کے منافی تھا۔

ایلی کے تمام ساتھی اپنے اپنے کام پر چلے گئے تھے۔ رفیق یوسف اور جمیل اب
ملازم تھے اور مختلف مقامات پر متعین تھے محلے میں صرف رضا کا بھائی ضیاء تھا۔ رفیق
کا بھائی صدر اور چند ایک اور اڑکے تھے جن سے ایلی کے زیادہ تعلقات نہ تھے البتہ
صدر اب بھی اپنی بیٹھک میں ادویات کوٹنے چھانے میں مصروف رہتا تھا اس نے
نگ آ کر اشتہاری حکیم کا کام شروع کر رکھا تھا۔

صدر ایلی کو دیکھ کر مسکرا اتا۔ اس کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ایلی کے راز
سے واقف ہو۔ ایلی کو دیکھ کر وہ اسے پکڑ لیتا ”آ و بھائی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو
گھڑی دو گھڑی کے لیے ہم بھی تو تمہارے چرنوں میں رہتے ہیں“، ایلی اسے دیکھ کر
گھبرا جاتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ صدر ہمیشہ ایسے انداز سے بات کرتا کہ ایلی

کو شہر ادیا دا آجائی اور اسے محسوس ہوتا جیسے صدر جان بو جھ کر شہزادی کی بات چھیڑنا چاہتا ہے جیسے وہ ایلی کو زبردستی اس بات پر مجبور کر رہا ہو کہ ایلی اسے راز داں بنالے اور راز داں بننے کے بعد وہ دونوں مل کر شہزادے محبت کریں۔

اے ہے

ایک روز جانو بنا نہیں ہوئی آئی اور سیدھی ایلی کے رعبرو آکھڑی ہوئی اور پھر ہونٹوں پر انکی رکھ کر حیرت سے ایلی کی طرف دیکھنے لگی۔ ایلی اپنے ہی خیال میں مگن بیٹھا رہا۔ اس پر شہزادے کب تک کھڑی رہے گی تو وہاں اسے تو اپنی بھی خبر نہیں کچھ۔

”تو کیوں تکلی بنی کھڑی ہے“
”اے ہے میں تو حیران ہوں“ جانو نے کہا

”پڑی ہو جیران یہاں کیا فرق پڑتا ہے“ شہزادے
”آخر بات کیا ہے“ بیگم نے پوچھا
”ہے وہاں تو مبارکیں مل رہی ہیں“
”کے مبارک مل رہی ہے“

”سے انہوں نے تو مجھے پکڑ لیا۔ تھانیدار کے گھر گئی تھی یہی جو بڑی ڈیورٹی کے باہر رہتا ہے۔ انہوں نے پکڑ لیا مجھے کہنے لگیں بڑا گھر تا کام ہے تم نے اور اب تو مجھ لو بات کلی ہو گئی۔ ہمارے گھر آئے تھے ناپوچھ چکھ کرنے کیا پڑی تھی جانو جواند رکی باقیں کرتے۔ ہم بات چھپا گئے اب سمجھ لوم عاملہ چل لگا“

”تو کھل کے بات کرے گی یا نہیں“ بیگم نے اسے ڈانٹا
”صاف بات تو کر رہی ہوں“ جانو بولی

”خاک صاف ہے۔ اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا“ بیگم بولی
”اے ایلی“ بیگم بولی ”وہ تو پہلے ہی سے نامزد ہو چکا ہے“

”اے ہے پتہ نہیں ان لڑکوں کا کیا اعتبار۔ وہ تو بڑی بڑی مبارکیں دیتے تھے کہتے تھے وہ لوگ اچھے ہیں گھر انہی اچھا ہے اور لڑکی کا بھائی جو آیا تھا وہ تو مشہور آدمی ہے۔ یہی کہتے تھے بھی اب تو بھی کچھ بولے گا،“ جانو نے ایلی کو چھوڑ کر کہا ”اوہوں،“ بیگم بولی ” یہ مجنوں کہاں بولے گا“ ”تو کیا وہ لیے کا خط تھا جو اس روز آیا تھا، شہزاد ملکر انی ” ”ہے وہ اخبار؟“ جانو نے کہا ”چلو یہ بھی اچھا ہوا، شہزاد بولی ” اس کا گھر بھی بس گیا“ ”بے گا تو جانیں گے،“ بیگم نے کہا اس کا پیر انھی سے لال ہور باتھا۔

نخلستان

چار ایک دن کے بعد جب ایلی اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ تو شہزاد پچکے سے دبے پاؤں اوپر آگئی۔ اور ایلی سے کہنے لگی ”آخر مجھ سے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کیوں خواہ تجوہ بھاگتے پھرتے ہو۔“

ایلی ہنسنے لگا ”خطرناک لوگوں سے دور رہنا ہی اچھا ہوتا ہے،“ اس نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

”کب سے ہوئی ہوں خطرناک“ وہ بولی

”شروع سے ہی تھی۔ مجھے احساس اب ہوا ہے“

”ایلی،“ وہ بولی ”بات مذاق میں نٹالو“

”ایمان سے مجھ تو سن کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ بے حد تمہیں ایک ساتھی مل گیا۔ مجھے بے حد خوشی ہے ایلی“ وہ سمجھیدہ ہو گئی ”مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ تم نے مجھے غلط سمجھا،“ اس کی آنکھیں پنم ہو گئیں، ماتھے کا تل سرخ پڑ گیا ”مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ایلی۔ کوئی مقصد نہیں، میں راستے میں دیوار نہیں بننا چاہتی۔ میں تو بری طرح پھنسی ہوئی ہوں ورنہ مجھے میں اتنی جرات ہے کہ سب کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ چل

پڑوں۔ لیکن ایلی میرے پاس تمہیں دینے کے لیے اب کیا دھرا ہے۔ کچھ بھی نہیں میں اس قابل نہیں کہ تمہاری زندگی کو روشن کر سکوں، وہ خاموش ہو گئی اور ایلی کے پاس کھڑی ہو کر اس کے بالوں سے کھینے لگی۔ ”مجھ سے ڈرونیں گھبراو نہیں میں میں تمہاری وہی شہزادوں مجھے لیا پر وہ رکھو گے لیکن تمہیں مجھ پر اعتماد بھی ہو۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ہر راہ پر یہ راستے آنکھیں لڑانے کی شوقیں ہوں تم سمجھتے ہو جس طرح تم نے میرے ہاتھ پکڑے تھے اسی طرح ہر کوئی میرے ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور میں چپ رہتی ہوں“

ہنگلی کی آواز سن کر ایلی نے ٹوپ کر پچھے دیکھا لیکن شہزادوں نے منہ موڑ لیا تھا۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہی پھر یوں ”یہ ٹھیک ہے تم میری زندگی میں خلستان ہو۔ اس صحرائیں صرف ایک خلستان ہے۔“

”جب میں نے پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تھا تو میں حقارت سے نہ پڑی تھی۔ جب سانوری نے مجھے بتایا تھا کہ اسے تم سے محبت ہے تو میں نے اس کا فداق اڑایا تھا۔ میں نے کہا تھا تجھے کیا نظر آیا ہے ایلی میں۔ بڑا ہی مضمکہ اڑایا میں نے اس کا پھر اس روز جب میں تمہیں کہانی سنارہی تھی اور تم نے میرے ہاتھ پکڑ لیے تھے نہ جانے اس وقت میں کیوں خاموش رہی ویسے مجھے تمہاری حرکت بہت بری لگی تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہو گیا تم نے باتیں کر کے مجھ پر کیا جادو کر دیا۔ تیری نگاہوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور پھر مجھ میں سکت نہ رہی اور اور شہزادے ایک لمبی آہ بھری۔“

”دیکھو شہزاد، ایلی بولا“ میں،“

شہزاد نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

”مجھے کہہ لینے دو آج۔ تم تو روز کہتے رہے ہو۔ آج میرا بھی چاہتا ہے کہ سب کچھ کہدوں جو شاید میں کبھی نہ کہتی وہ بھی کہہ دوں میں کئی بار بیٹھی سوچا کرتی تھی مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرا اگھر ہے میرے پچھے ہیں میرا خاوند ہے جو میری ہربات مانے کے

لیے بے چین ہے پھر مجھے کیا ہو گیا ہے میں کیا کر رہی ہوں۔ انجام کیا ہو؟ وہ رک گئی۔

”میں نے بہت ہی سوچا لیکن میں ہار گئی پار گئی ایلی،“ اس کی بھکی نکل گئی
”میں نے محسوس کیا کہ تم ہو تو زندگی میں کبھی کچھ ہے تم نہیں تو کچھ بھی نہیں نہ
جانے کیوں جی چاہتا کہ تم میرے پاس رہو صرف یہی اور کچھ نہیں مجھے تم سے کوئی
غرض نہیں کوئی مقصد نہیں“ ایلی کے سر پر پانی کی اک بوندھ رہی۔ اس نے سراٹھیا
شہزادے اس کے سر کو زبردستی موز دیا۔

”یونہی بیٹھے رہو میری بات نہ کاؤ،“ وہ بولی

”میں نے خواہ خواہ ان سے بگاؤ کی صورت پیدا کر لی۔ معلوم نہیں کیوں لیکن
انہیں دیکھ کر مجھے غصہ آتا ہے خواہ خواہ میں ان کی ہربات رد کر دیتی ہوں میں نے ان
کو عاجز کر دیا ہے جیسے وہ میرے میاں ہی نہ ہوں۔ مجھے ان سے نفرت ہو چکی ہے
نفرت“

سیڑھیوں میں سے جانو نے سر نکالا ”لو تم یہاں ہو اور میں تمہیں وہاں ڈھونڈ رہی
ہوں واہ واہ“ وہ بولی

”جانو تم جاؤ،“ شہزادے سر دھہری سے کہا

”کیوں“ وہ بولی

”بس کہہ جو دیا“

”اے ہے ہندیاں جوں کی توں پڑی ہے،“ جانو نے کہا ”او تم“
”ہندیا کو چو لہے میں ڈال دو،“ شہزادے اپنے ہاتھ ایلی کے سر سے ہٹائے بغیر
کہا۔

”لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو،“ جانو نے پوچھا

”میں ایلی سے بات کر رہی ہوں،“

”اے ہے اتنی ہی خاص بات ہے کیا؟“

”ہاں اس سے بھی زیادہ“

جانو ہونٹوں پر انگلی رکھے اُلٹے قدم چلتے ہوئے بولی ”اے کوئی خدا کا خوف کرو اگر تمہاری ماں نے دیکھ لیا تو“
”اگر وہ آئے، شہزادے کہا“ تو اسے بھی کہہ دینا کہ اوپر نہ آئے میں ایسی سے بات کر رہی ہوں، جانے سینہ تھام لیا ”تو بس ہے تمہارا تو جواب نہیں“
کچھ دیر کے لیے وہ خاموش کھڑی اس کے بالوں سے کھیاں رہی پھر بولی ”تم میرا ہاتھ تھماتے تھے تو میں اسے جھک دیتی تھی تاکہ بات کا رخ نہ بدل جائے۔ یہ بہشت دوزخ نہ بن جائے۔ اس لیے کہ میں اپنی نگاہ میں آپ نہ گرجاؤں چور نہ بن جاؤں اور پھر مجھ میں اتنی ہمت نہ رہے کہ سینہ تان کر لوگوں سے بات کر سکوں۔“

”مجھے بدنامی کی پرواہیں ایسی لوگوں کی باتوں کی پرواہیں لیکن اپنی نظر میں آپ گرجانے کی پرواہ ہے۔ اس لیے میں تمہارا ہاتھ جھکلتی رہی تمہیں روکتی رہی مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اس کا برآنا نوگے۔“

”تم سمجھتے رہے کہ مجھے تم سے صرف دکھانے کی دلچسپی ہے تم سمجھتے رہے کہ میں بے پرواہوں بے حس ہوں لیکن“ اس کی لیکھی انکل گئی۔

ایسی دیوانہ وار اٹھ بیٹھا۔ شہزادے اسے روکا ”میری بات سن لو، لیکن شہزادے کی باعثیں ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔

عین اس وقت بیگم نے زینے سے سر نکالا ”تمہاری خاص بات ابھی ختم نہیں ہوئی کیا۔“ اس کے انداز میں غصہ اور طعنہ تھا۔

”تمہارے دخل دینے سے کیا ختم ہو جائے گی، اماں،“ شہزادے جواب دیا

”تم تو اس گھر کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو،“ بیگم غصے میں چلائی

”یہ تو گھر والا جانے ماں تم کیوں فکر میں گھٹلی جا رہی ہو“

”وہ تو مجھے پتہ ہے کہ یہ گھر میرا نہیں“ بیگم کی آنکھیں چھلانے لگیں
”تو کیا اس گھر کو بھی تباہ کرنے کا ارادہ ہے؟“ شہزادے مسکرا کر کہا
بیگم دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی

”آؤ ایلی،“ شہزادے بیچھے چل کر چاہئیں، یہ کہہ کرو وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔
ایلی بیگم کے پاس بیٹھ گیا۔ یوں بیگم کو چھوڑ کر نیچے جانے کی اس میں جرات نہ تھی۔
دیر تک وہ بیگم کو بہاڑا تارہا تسلی دیتا رہا اور بیگم پہنچ آنسو بھائی رہی۔

گھر میں کوئی نہیں

امتحان کا نتیجہ نکلنے سے چار ایک روز پہلے ایلی لاہور روانہ ہو گیا اسے نتیجے کے متعلق
کوئی دلچسپی نہ تھی چونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ پاس نہیں ہو سکتا۔ جس زمانے میں اس کے
ہم جماعت صحیح و شام مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ وہ کتاب کھول کر خیالات میں
کھو جایا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پوری توجہ سے پڑھنے تا کہ اس کا سال ضائع نہ ہو۔
پہلے ہی وہ اچھے نمبروں پر پاس ہو۔ منصار سے ایک لاکٹ اڑ کا سمجھتا تھا اور ایلی چاہتا تھا
کہ منصر کی وقوعات پر پورا اترے لیکن جو نبی وہ کتاب اٹھاتا پہلی ہی لائن میں کوئی نہ
کوئی ایسا الفاظ آ جاتا کہ اس کے خیالات کا رخ بدل جاتا اور وہ سوچ میں کھو جاتا اور
کتاب جوں کی تو اس کے ہاتھوں میں وہری کی وہری رہ جاتی۔

ایلی کو پاس ہونے کی قطعی امید نہ تھی۔ نتیجے کے لیے لاہور جانے سے اس کا مقصد
صرف سفید منزل کے افراد سے مانا تھا۔

اپنا سوت کیس ایک ہوٹل میں رکھ کر وہ سیدھا سفید منزل میں پہنچا۔ دوپہر کا وقت
تھا۔ سفید منزل کا نچلا حصہ ویران پڑا تھا۔ کچھ دیر وہ اس ہال نما ڈیوڑھی میں کھڑا رہا
تا کہ کوئی آئے تو اس سے پوچھ سکے۔ پھر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہ پا کرنے
جانے اسے کیا سوچی کوہ زینے پر چڑھ گیا۔ اور اس نے دوسری منزل کا دروازہ جا

کھلکھلایا۔ دیر تک کسی نے جواب نہ دیا پھر دور سے آواز آئی ”کون ہے؟“

ایمی نے پھر دروازہ کھلکھلایا۔ کچھ دیر کے بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے خود ساری کھڑی تھی۔ ایمی کو دیکھ کر سادی نے چین ماری اور پھر قہقہہ مار کر ہٹنے لگی ”باجی! باجی!!“

”کیا ہے؟“

”آؤ آج جلدی ہی ہی ہی“ وہ ہٹنے لگی
”ارے کیا واقعی“، دور سے باجی کی آواز سنائی دی
”بے بھا گو روز امر“ سادی چین رہی تھی۔

اوپر ایک طوفان بدمیں مچنے لگا۔ جس عین قہقہہ چین، آوازیں اور نہ جانے کیا کیا شامل تھے۔ ایمی کھرا گیا۔ اور چپکے سے بیچھے اڑا آیا۔ بیچھے صدر دروازے کے قریب وہ یوں معصوم انداز سے کھڑا ہو گیا جیسے ابھی ابھی داخل ہوا اور اس شور شرابے کے متعلق اسے قطعی علم نہ ہو جو سفید منزل میں چاہوا تھا۔

پھر وہ مگ پر آ کھڑی ہوئیں اور سلاخوں سے بیچھے جھانکنے لگیں۔

”بھاگ گئے کیا“، باجی بولی

”میدان کے مرد ہیں“، سادی نہیں

”اب منہ بھی چھپا لیجئے“

”دو پل پھینکوں“

”اونہوں شرمائی نہیں“

”ڈریے بھی نہیں وہ بندوق والے چلے گئے“

وہ دونوں ایک ساتھ چلا رہی تھیں قہقہہ لگا رہی تھیں۔

”قریب کیوں نہیں آتے“

”پتلون پیچھے سے رنو کی ہوئی ہے نا اس لیے“

”ہئے دبلے ہو گئے ہیں“

”نہ بھا دوں سو کھے نہ ساون ہرے“

اس پر وہ دونوں قیقهے لگا نے لگیں پھر خاموشی چھا گئی

ایلی جوں کا توں کھڑا رہا۔

پھر زینے میں بڑے بڑے بوٹوں کی چاپ سنائی دئی۔ ایلی چوڑکا

ایک زینے سے سادی اتری اس کے سر پر پانچ چھوپے پیوں لپٹے ہوئے تھے۔

جیسے بہت بڑی پلڑی ہو۔ جسم پر کالا اچکن تھا اور پاؤں میں فوبی بولٹ تھے۔

وہ وہیں رک گئی ”کون ہے؟“ اس نے بھاڑی آواز بنانا کر لیا ”گھر میں کوئی نہیں“

وہ بولی

اتنی سی چوری

ایلی خاموش کھڑا رہا اور پنگلے کی سلاخوں سے با جی کا چھرا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”آپ کس سے ملیں گے؟“ وہ بولی

”آپ سے؟“ ایلی اس کی طرف بڑھا

سادی نے شور مچا دیا۔ ایک بار پھر سارا گھر قیقهوں سے گوئختے لگا

ایلی سادی کے پیچے بھاگا وہ آگے آگے قیقهے لگاتی وزیری تھی۔

ایلی کی کوشش تھی کہ اس کے سر سے ایک دو پٹہ اتارے

وہ دونوں اوپر جا پہنچا ایلی زینے کے دروازے میں رک گیا۔

”بس“ با جی چلا لی

”آگے پر جلتے ہیں“ سادی نے شور مچایا

”یہ دو پٹہ مجھے دے دو“ ایلی نے کہا

”کیوں پگڑی باندھنے کا ارادہ ہے؟“

”روم بناوں گا“

”اوہ روماں یہ دو کان نہیں شریف زادیوں کا گھر ہے“ سادی نہیں
ایلی جلال میں آگیا ”وہ سلاگا ہوا سگرٹ بیار ہے“ وہ بولا

”اچھا“ وہ چلائی ”جب خلیل فاختہ اڑیا بڑتے تھے“

”اب بھی فاختہ اڑا سکتے ہیں خلیل“ وہ بولا

”وان تو مکتوں کو دیتے ہیں“ سادی نہیں ”چھین کر لے جائیے“

”ہے ہمت“ باجی بولی

”اوہوں“ سادی چلائی ”صرف دروازے تھے“

”اور اگر چھین لیا تو انعام“ ایلی بولا

”جو مانگو گے ملے گا“ سادی نے قبھہ لگایا

”شرط یہ ہے کہ سر کا دو پٹا تار دو“ باجی بولی

”میں شور مچا کر محلے کو اکٹھا کر لوں گی سوچ لجھے“ سادی ہٹنے لگی

”اور اگر کوئی آگیا تو؟“ باجی نے کہا

”تو یک بینی دو گوش“ سادی نے قبھہ لگایا

”تو تیار ہو جاؤ“ ایلی نے کہا ”مابدولت تشریف لاتے ہیں“

”حرم میں تو صرف خواجہ سرا آتے ہیں مابدولت نہیں“ سادی ہٹنے لگی

”کیا واقعی یاد حملی دے رہے ہیں“ باجی نے سادی کو مخاطب کر کے کہا

”یہ تو بھگت ہیں سورما ہوتے تو خطرہ بھی ہوتا“ سادی چلائی

”خالی مالا جپتے ہیں کیا؟“

”وہ بھی رام نام کی جھبھی تو بن باسی ہیں آج کل“ سادی بولی

ایلی نے جست بھری اور سادی کی طرف لپکا

سفید منزل میں کہرام مج گیا وہ آگے بھاگ رہی تھیں۔ چیخ رہی تھیں قبھہ لگا رہی

تحمیں پیچھے تھا۔ اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ وہ سفید منزل میں آنکھ پھولی کھیل رہا ہے۔ وہ بھول چکا تھا کہ گلی کے سب لوگوں دروازے کھول کر سفید منزل کی طرف حرمت سے دیکھ رہے ہیں وہ بھول چکا تھا کہ وہ منصر کا دوست ہے اس نے منصر سے وعدہ کیا ہے کہ برآ راست ان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔ اور اس سفید منزل کے ہغرا فیہے قطعی طور پر واقفیت نہیں۔

دیر تک وہ بھاگتے رہے پھر ایلی نے سادی کو پکڑ لیا۔ سادی نے با آواز بلند چار ایک چینیں مار دیں اور دو پپڑ اپنے گرد پیٹھ لیا۔ بعد مشکل ایلی نے دو پپڑ الگ کیا۔ سادی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کانا۔ اس کے بال بھرے ہوئے تھے منہ سرخ ہو رہا تھا۔ ایلی دو پپڑ لے کر بھاگا۔

جب وہ صحن میں پہنچا تو سامنے ایک ضعیف عورت کھڑی حرمت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند ایک ساعت کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے کے روپ و کھڑے رہے پھر ایلی گھبرا گیا۔

ضعیف عورت نے چینا شروع کر دیا ”چور چور“

ایلی گھبراہٹ میں اندر کی طرف بھاگا

پھل منزل سے شور سنائی دیا

سادی اور باجی دونوں سمجھیدہ ہو کر پوچھنے لگیں ”کون چور؟ کہاں ہے چور دادی اما؟“ لیکن بڑھیا بر ایر چلاتی رہی چور چور دوڑو دوڑو پھر صحن میں دوچار دوں کی آوازیں سنائی دیں ”کیا بات ہے کیا ہوا؟“ ایلی کا دل ڈوب گیا اب وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

اس وقت سادی بھاگی بھاگی آئی اس نے ایلی کی بانہہ پکڑ کر اسے گھیٹا اور ایک زینے میں دھکیل دیا۔

کچھ دیر تک وہ وہاں چپ بیٹھا رہا۔ باہر سے باقی صاف سنائی دے رہی تھیں ”یہاں تو کوئی چور نہیں ہے“ سادی کہہ رہی تھی ”میں بھائی جان کے کپڑے پہن کر باجی کوڈ را رہی تھی۔“

”اے ہے میں کیا پاگل ہوں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“
دقائقاً ایلی کو خیال آیا۔ اسے وہ چونکا یہ تو وہی زینت ہے جس کے نیچے ہم ملا کرتے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کاٹھ کباز سے بچتا ہوا نیچے اتر گیا۔
نیچے جا کر اس نے دروازے کو آزمایا جو باہر گلی میں کھلتا تھا لیکن وہ باہر سے بند تھا۔
وہ ماپس ہو گیا اور وہ مکان کا کونہ کونہ دیکھ رہے تھے۔
نہ جانے کب کوئی زینتے سے آتے
ایلی نے اس دروازے کی درز میں سے دیکھا جو سفید منزل کے اندر کھلتا تھا۔ باہر
ہال نماڈیو ٹھی میں کچھ لوگ کھڑے تھے۔ بہر حال باہر لکھنا مشکل تھا۔

اس نے دروازے کی کنڈی کھلی رہنے دی اور پھر آہستہ آہستہ پٹ کھونے شروع کر دیئے۔ تاکہ دروازہ کھلا ہو تو انہیں وہاں دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو پھر وہ دروازے کے پٹ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

چند ساعت کے بعد ایک محلے دار داخل ہوا۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔

محلے دار سیدھا آگے نکل گیا۔ پھر وہ زینتے میں جھانک کر بولا ”یہاں تو کوئی بھی نہیں“ یہ کہہ کر وہ ایلی کی طرف مڑا۔ وہ ایلی کی طرف دیکھ کر مسکرا یا اور بولا ”کیوں صاحب اس کو نہ میں ہے کوئی“ ایلی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ اس کے انداز سے دوستانہ محبت لپک رہی تھی ”یہاں بھی نہیں نا“ وہ بولا ”میرا خیال ہے گھروالوں کو خواہ خواہ شک پڑا ہے ہے“

”جی ہاں“ ایلی نے کہا

نووارد اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ایلی کے شانے پر رکھ دیا۔ ”اوچلیں، وہ بولا“ تلاش بے کار ہے“

اس کا خاموش ہاتھ ایلی سے سب کچھ کہہ رہا تھا لیکن گھبراہٹ کی وجہ سے ایلی نے اس کے گونگے پیغام کو نہ سمجھا۔

”جی جی میں میرا مطلب ہے“ ایلی نے کچھ کہنے کی اوشش کی۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے“ اس نے ایلی کو تھکتے ہوئے کہا اور پھر اس کے قریب تر ہو گیا۔

”میں جانتا ہوں میں ماننے کھر میں رہتا ہوں“ یہ کہہ کروہ اسے باہر لے آیا اور وہ سب سفید منزل سے باہر نکل گئے۔

ایلی کے دل میں جذبات کا ایک غصیم تلاطم موجود تھا۔

اپنے مکان کے سامنے پہنچ کر محلے دار کا ”آئیے جیٹھے“ اس نے ایلی سے کہا“ چائے پی کر جائیے“

”بڑی مہربانی ہے مجھے جانا ہے“ ایلی نے جواب دیا

محلے دار کے مکان پر ایک خختی آؤ زیاد تھی جس پر لکھا تھا۔ ڈاکٹر اسماعیل ”ارے“ ڈاکٹر اسماعیل چلایا ”یہ دیکھئے“ اس نے ایلی کی پتلون کی طرف اشارہ کیا پتلون کی جیب میں سے سادی کے دو پتے کا ایک حصہ باہر لکھا ہوا تھا۔

”کیا یہ چوری کا مال ہے؟“ ڈاکٹر ہنسنے لگا

”جی“ ایلی بولا

”کیا ہے؟“ اس نے پوچھا

”وو پتھے ہے“

ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا ”بس صرف اتنی سی چوری اس کو تقسیم بھی نہیں کیا جا سکتا لہذا حصہ مانگنا بے کار ہے۔“

ایلی ہستا ہوار خست ہو گیا۔

شہ کی سواری

گلی پر خاموشی چھا چکی تھی۔ جنگلوں میں پڑے تھے۔ سفید منزل میں کوئی دکھائی نہ دے رہا تھا۔

دوسرا روز ایلی چھپ کر ہوٹل میں بیٹھا رہتا تاکہ اسے کوئی لیکھنے پائے اور یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ اس روز لا ہو رہیں موجود تھا جب سفید منزل میں ہنگامہ ہوا تھا۔

اسے یقین تھا کہ منصر کی آمد پر کھر میں ایک بار پھر ہنگامہ ہو گا اور کراموز اس واقعہ کی نوعیت پر بحث کریں گے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ منصر کو سب سے پہلی ایلی کا خیال آئے گا اور ممکن ہے وہ اس امر کی تحقیق بھی کرے کر ایلی لا ہو رہے نہیں۔

ایلی کو عجیب سے وہم ستارہ ہے تھے شاید وہ علی پور میں تھانے دار کے نام جوابی تار بھیج دے۔ جس تھانیدار کے ہاں انہوں نے ایلی کے متعلق تحقیق کی تھی۔ شاید ڈاکٹر اسماعیل اس پر وہ راز افشا کروے اور نہ کہہ دے

”گھرانے کی بات نہیں۔ کوئی چور و نہیں آیا۔ اپنے آدمی کو چور نہیں سمجھا کرتے“
یا شاید یہ سوچ کر کہ ایلی نے تو راست گولی کے تخت پر گی بات بتاہی دیتی ہے سادی اور باہمی منصر کو پہلے ہی تحقیقت حال سے آگاہ کر دیں۔ اس کے بعد اگر ایلی نے جھوٹ بولتا تو منصر پر کیا اثر پڑے گا۔

دوسرا روز وہ بیٹھا سوچتا رہا۔

تیسرا روز رات کے بارہ بجے نتیجہ کا اعلان ہونا تھا۔ ایلی نے نائم ٹیبل دیکھا اور گاڑی کے وقت شیش پر پہنچا وہاں سے وہ ایک دوسرے ہوٹل میں گیا اور وہاں جا کر کمرہ لے لیا تاکہ رجسٹر میں جوان دراج ہو بر وقت ضرورت اسے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکے پھر مطمئن ہو کر وہ باہر نکل گیا۔

نیلے گنبد میں جب وہ چائے پی کر بابا ہر لکھا تو اس نے دیکھا کہ منصر موڑ سائیکل پر آ

رہا ہے۔ اس نے آواز دی۔ منصر رک گیا۔

”ارے، وہ بولا“ آپ یہاں؟“

”جی،“ ایلی نے کہا

”کب سے؟“ منصر نے سرسری انداز سے پوچھا

”دوپھر کی کاڑی سے پہنچا تھا۔ ہوٹل میں سامان رکھ کر آپ کی طرف جا رہا تھا۔“

”کچھ دیر پھر نے کاڑا دہے کیا؟“ منصر نے پوچھا

”اب جو نتیجہ بنتے کے لیے آیا ہوں تو“

”اوہ،“ منصر بولا ”جس تلو آپ کا نتیجہ لکھنے والا ہے،“

”جی،“ ایلی نے کہا

”آپ تو شاید پاس ہیں،“ منصر نے سوچتے ہوئے کہا ”یا شاید“ وہ رک گیا۔

”درachi،“ اس نے بات شروع کی ”مجھے آپ کا روپ نمبر یا نجیس تھا کیا تھا؟“

ایلی نے اپنا روپ نمبر بتایا

”ہاں،“ منصر بولا ”شاید یہی تھا مجھے اچھی طرح یاد نہ تھا لیکن اپنے ایک جانے والے کو پہلے ہی سے نتیجے کی ایک نقل مل گئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تو تھا اگرچہ اچھی طرح مجھے آپ کا نمبر یاد نہ تھا اوہ ”وہ چونکا“ شاید میں نے پر زے پر نقل بھی تو کیا تھا،“ اس نے جیب سے کاغذ کا ٹکڑا ڈھونڈ نکالا ”ہاں یہی ہے“ اس نے کہا ”اتفاق کی بات ہے،“ وہ خاموش ہو گیا۔

پھر آپ ہی آپ کہنے لگا ”تو سمجھ لججھے کہ آپ پاس ہی ہیں۔ پاس ہی ہوئے نا وہ کیا ہوتا ہے ہاں شاید (Compartment) کمپارٹمنٹ کہتے ہیں اسے، آپ کمپارٹمنٹ میں ہیں۔ لیکن صاحب آپ نے کمال کر دکھایا۔ جن حالات میں آپ نے امتحان دیا تھا،“ وہ ہنسنے لگا ”اس کے باوجود اگر کمپارٹمنٹ میں آسکتے ہیں تو مجھے

ڈر ہے کہ ہمیں آپ کی عزت کرنی پڑے گی ”وہ ہنسنے لگا“ آئیے چلیں،

ایلی موڑ سائیکل کے پیچھے بیٹھ گیا اتنی دیر کے بعد شاہ کی سواری رسمی ترک و احتشام سے ایک مرتبہ پھر لاہور کے بازاروں میں چل پڑی۔ لوگ دورو یہ کھڑے ہو کر نعرے لگا رہے تھے لیکن ان غروں میں بھی بھار چور چور کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

دفعاً بھیڑ میں نے ایک شخص آگے بڑھاں نے ہاتھ سے اشنازہ کیا

”آپ کا کوئی جانے والا معلوم ہوتا ہے“ منصر نے سائیکل روکتے ہوئے کہا“ جب تک میں سامنے والی دکان سے سکرٹ خرید لوان“

وہ سائیکل سے اتر لاؤں کے رو رہا یہم کے سڑاں رہا تھا

”تم کب آئے؟“ ایم کے نے پوچھا

”نتیجہ سننے آیا تھا“

”ارے نتیجہ تمہیں معلوم نہیں ہوا میرا تو خیال تھا کہ تمہیں آٹھ روز پہلے ہی پہنچ گیا ہوگا“

”وہ کیسے؟“ ایلی نے پوچھا

”یار میرا بھائی یونیورسٹی میں ہے۔ ایک روز میں وہاں بیٹھا تھا تو منصر کا ٹیلی فون آیا تھا منصر نے اسے تمہارا ول نمبر لکھوا یا تھا کہ نتیجہ مرتب ہو جائے تو اسے اطلاع دے۔ بھائی جان نے آج مجھے بتایا تھا کہ آٹھ روز ہوئے منصر کو اطلاع دے دی تھی“

”اچھا“ ایلی نے جیرانی سے کہا

”منصر نے تمہیں اطلاع نہیں دی؟“

”نہیں تو“

”تو پھر پوچھنے کا کیا فائدہ“ ایم کے جیرانی سے چلایا۔

اتفاق سے

ایم کے سے رخصت ہو کر جب وہ پھر سائیکل پر سوار ہوا تو وہ گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا اس کی نگاہوں تلے منصر کھڑا کہہ رہا تھا
 ”اچھا تو آج آپ کا نتیجہ کل رہا تھا“

”آپ تو شاید پاس ہیں یا شاید دراصل مجھے آپ کا روپ نمبر یاد نہیں تھا۔ ایک جاننے والے کے پاس نتیجہ کی نقل تھی لیکن مجھے آپ کا نمبر پاس ہی مجھے کیا کہتے ہیں اسے ہاں کمپارٹمنٹ میں ہیں آپ؟“

پھر اسے ان دلوں کا خیال آیا جب وہ مشن کان لج میں امتحان دیا کرتا تھا۔ اور جب پر چدے کر باہر آتا تو منصر آنکھ تھا۔ اور آپ بیان امتحان دے رہے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں آج گل ادھر لئے کیے جاتا ہوں“

”اتفاق سے کہیں آپ ان دلوں سفید منزل کی طرف تو نہیں گزرے؟“

منصر کی تمام باتیں بالتفصیل باری باری اس کے سامنے آ رہی تھیں۔ اس نے حیرت سے منصر کی طرف دیکھا تو یہ سب اتفاقات سمجھے ہوئے ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ منصر کے گرد اپنے بازو و حمال کر دے۔ ”آپ پریشان کیوں ہیں پرسوں میں آپ کے ہاں گیا تھا۔ دادی اماں ٹھیک کہتی ہیں وہ میں تھا اور اب میں ایسی حرکت بھی نہ کروں گا لیقین جانیے کبھی نہیں“

لیکن سائیکل تیزی سے چلا جا رہا تھا اور اس کے لیے اپنی جگہ قائم رہنا مشکل ہو رہا تھا

سفید منزل پہنچ کر منصر نے اسے اپنے کمرے میں بٹھا دیا۔ ”الیاس صاحب آپ ذرا بیٹھئے یہ کتاب ہی دیکھئے میں ابھی آیا“ یہ کہہ کر وہ اوپر چلا گیا۔

ایسی کے دل میں منصر کے لیے احترام اور محبت کے جذبات موجز ن تھے۔ اسے آج تک کسی ایسی شخصیت سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ جس کا اظہار اس قدر انوکھا اور

رُنگیں ہو۔

منصر کا کمرہ بھی اس کی بے پرواںی، رُنگیں، ذہانت اور عظمت کا مظہر تھا۔ کمرے میں رُنگوں کی ہم آہنگی کس قدر دلنواز تھی۔ پنگ کی چادر بھی اس کا ایک جزو محسوس ہو رہی تھی۔

قول اور قریب ہے گے ”ہمیں لذ و لکھا و ہمیں لذ و لکھا و“
”اپنی ماں سے ناگو اپنی ماں سے ناگو“ سادئی تالی بجاتے ہوئے گانے لگی۔
پنگ کے پاس ہی ٹیپروپڑے تھے۔ کیسے گد گدے پاؤں ہیں اور اس کی وہ تصویر جو کارنس پر پڑی تھی سل قدر رجا فیب نگاہی۔

”ایساں صاحب“ منصر نے داخل ہوتے ہوئے کہا ”ماں کہتی ہیں کہ آپ ہمیں کھانا کھائیں گے اگرچہ یہ دعوت رہی نہیں۔ رسم کے ہم قابل نہیں اور ہوتے بھی تو اس وقت کچھ بھی تیار نہیں ہو سکتا اور پھر چار ایک لقے کھانے والے کے لیے کوئی تیاری بھی کیا کرے۔ اب آپ بلا تکلف بتا دیجئے کہ آپ چاول کھائیں گے یا روٹی۔ میں تو ذاتی طور پر چاول کھانا پسند کرتا ہوں۔ لیکن وونوں چیزیں تیار ہیں اس لئے تکلف بر طرف“

”جی میں تو روٹی کھاتا ہوں“ ایلی نے کہا

”تو ٹھیک ہے“ پھر اس نے اوپر کی طرف منہ کر کے آواز دی ”بھی ایساں صاحب روٹی کھائیں گے اور میں تو آپ جانتے ہیں چاولوں کے ہوتے ہوئے اور کچھ نہیں کھاتا“

”تو کیا بھجوادیں کھانا؟“ اوپر سے اماں کی آواز آئی

”کیوں ایساں صاحب کیا خیال ہے؟“

”جب آپ کا جی چاہے“ ایلی نے کہا
وہ نہس کر بولا ”بھی ہم تو جب مل جائے تب کھاتے ہیں جی کا کیا ہے وہ تو ہر وقت

چاہتا ہی رہتا ہے۔ اپنا تو اصول ہے جب ملے کھاؤ۔ بھوادیجئے اماں جان، منصر نے
با آواز بلند کہا

”آپ تو شاید ہاتھ دھونا پسند کریں میں تو ویسے ہی اڑا جاتا ہوں“ وہ ایلی سے
کہنے لگا کہانے میں پلاو کے علاوہ تم نہ کہان تھے
”ارے“ منصر کھانا دیکھ کر چلایا ”آج تو یہ خوش قسم معلوم ہوتے ہیں ہ“
آج تو اتفاق سے پلاو ہے۔ پلاو کے ہوتے ہوئے آپ روٹی کھانا کیسے گوارا کریں
گے۔ تعجب ہے صاحب الگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو ارادہ بدل لیتا، لیکن ایلی کے
لیے اب اپنی بات بدلتا ممکن نہ تھا اس میں اتنی جراحت نہ تھی
”اتفاق سے آج پلاو ہے“ منصر کے منہ سے اتفاق سے ”من کرائیں کے ہوئوں
پر مسکراہٹ آگئی۔

منصر نے کبھی سہوا بھی ایسی بات نہ کی تھی جس سے ذاتی خاندانی یا گھرانے کی
عظمت یا امارت ظاہر ہو۔ وہ کوئی ایسی بات نہ کرتا جس سے دوسرا اکٹھ محسوس کرے۔
وہ اپنے آپ کو ہمیشہ اوسط ذہنیت اور حیثیت کا شخص ظاہر کرتا تھا۔

نمک بھری روٹی

ایلی نے پہلا ہی نوالامنہ میں ڈالا تھا تو اس کامنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ روٹی میں کوٹ
کوٹ کر نمک بھرا ہوا تھا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ منصر نے پوچھا
”کچھ نہیں“ ایلی نے کہا ”ذر اگرم ہے“
”اوہ یہ بات ہے“

ایلی کو فوراً معلوم ہو گیا کہ یہ سادی کی شرارت ہے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ منصر کو اس
کا علم ہو۔ لیکن اس قدر نمک کھانا کچھ آسان نہ تھا۔ بہر حال وہ یوں روٹی کھاتا رہا
جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

”اے صاحب یہ کیا کھانے کا طریقہ ہے“ منصر نے کہا ”آپ تو یوں کھا رہے ہیں جیسے نمک چکھ رہے ہوں۔ شاید تہذیب کے خیال سے ایسا کرو رہے ہوں بہر صورت کھانے کے معاملے میں ہم لوگ پیٹ بھر کر بد تہذیب ہیں۔ جب تک تمیز اور تہذیب کو بالائے طاق نہ رکھ دیں ۔ ہم سے کھایا ہی نہیں جاتا۔ اور صاحب پلاو دیکھ کر تہذیب کے میادور ہے گی۔ مرزا غالب نے آم سے متعلق کہا ہے ناکہ آم اعلیٰ ہوں اور بہت ہوں اگر میں شاعر ہوتا تو یہی بات پلاو کے متعلق کہتا۔“

پچھوڑیتک منصر پلاو کھانے میں مہمک رہا لیکن اس دوران میں اس نے چار ایک بار سے ایلی کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا ”ایسا صاحب ذرا یہ ساتھواں کرے سے کالی مرچ کی بوتل تو لا دیجئے مجھے معاف کرنا بھائی کھاتے وقت ہم سے تو اٹھا نہیں جاتا۔“

”کہاں ہے؟“ ایلی جھٹ اٹھ بیٹھا
”اس ماحقر کمرے میں جائیے نا تو آپ کو بتاؤں“
ایلی ساتھواں کمرے میں داخل ہو گیا
منصر نے چلا کر کہا ”پہلے تو بھی جلائیے نا داعیں ہاتھ دروازے کے پیچے سونج ہے
مل گیا؟“

”بھی“ ایلی نے بتی جلاتے ہوئے کہا
”کارنس پر دیکھئے“ منصر بولا
”یہاں تو نہیں“ ایلی نے کہا
”تو دونوں الماریاں دیکھئے“
”چلے نہیں ملتی تو چھوڑیے“ منصر نے چلا کر کہا
جونہی ایلی واپس کمرے میں داخل ہوا تو منصر نے شور مچا دیا ”اہو ہو ہو“ منصر بے تھاش مسکرانے جا رہا تھا۔

”یہ دیکھ لیجئے میری پلاو کھانے کی گرم جوشی کا نتیجہ“ اس نے گلاس کی طرف اشارہ کیا جو ایلی کی روٹی کی پلیٹ پر گرا ہوا تھا ”تمام روٹیاں تر ہو گئی ہیں۔ ٹھہریئے میں اور منگواتا ہوں“ اماں اس نے اوپر آواز دی ”دو ایک روٹیاں اور بیچ دیجئے میرے لیے میں سمجھتا ہوں الیاس صاحب کے ساتھ روٹی کھانے میں بھی مجھے ساتھ دینا چاہیے ذرا جلدی کیجئے“ منصر کی بامعنی مسکراہٹ کو دیکھ کر ایلی کے کان میں آواز آئی ”اتفاق سے“

وہ سوچنے لگا کہ کہیں منصر کو روٹی کے نمک کا راز تو نہیں معلوم ہو گیا اس نے گلاس گرنے کی آواز نہیں سنی تھی اس کے علاوہ پانی سے صرف روٹیاں بھیکی تھیں کسی اور پلیٹ میں پانی کی بوندستک نہ گردی تھیں۔ کوئی اس کے کان میں منڈال کر نہیں رہا تھا۔

جب منصر کھانے سے فارغ ہو کر باہر کلا تو ایلی نے دیکھا کہ پنگ کے نیچے روٹی کا چھوٹا سا نوالہ اگلا پڑا ہے ”اتفاق سے اتفاق سے“ کمرے میں گئی ہوئی گھری تھیں لگا رہی تھی۔

ایلی رخصت ہونے لگا تو منصر نے کہا ”کب جا رہے ہیں آپ؟“

”کل“ ایلی نے جواب دیا

”جانے سے پہلے ملیں گے تو ضرور آپ“ وہ مسکرائے لگا

”جی ہاں“

”ہاں وہ ایک بات تو میں بھول گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کے علی پورے آیا ہوں۔ اتفاقاً توہاں جانا ہوا۔ تو پھر میں نے سوچا کہ چلے آپ کے محلے کو بھی دیکھنا چلوں“ اس کے ہونٹوں پر ایک نہایت لافریب مسکراہٹ تھی ”اب مزید اتفاق سمجھے جہاں میں ٹھہر اہوا تھا اس کے عین مقابل میں آپ کے محلے کی ڈیوڑھی تھی“

”ارے صاحب“ وہ کچھ و قفے کے بعد بولا ”آپ تو اچھے خاصے تو ارینجی لوگ

ہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کے آئندھی تو آج تک ماضی سے متعلق ہیں۔ اونچے اوپرے محل جو بدرنگ ہو چکے ہیں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں وہی نقشہ ہے جو ہمارے ہاں بھی یہاں وہاں جھلکتا ہے۔“

”اچھا تو آپ علی پور گئے تھے؟“ ایلی نے معنوی تعجب سے کہا
”صرف چند گھنٹوں کے لیے“ منصر بولا۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہم ایک اوسط خاندان کے لوگ ہیں۔ صرف کھاتے پیتے۔ امانت تو قصہ پاریز ہو چکی۔ جیسے کہ آپ کے ہاں بھی ظاہر تھا، ہم خاندانی عظمت کے قائل نہیں بلکہ صرف یہی ایک خیال ہے کہ کوئی ایسے خاندان سے متعلق نہ ہو جیسے مثلاً میر اٹی، وہ ہنسنے لگا۔

”اب آپ سے کہہ دوں تو کیا ہرج ہے کہ اماں مطمئن ہیں ہماری طرف سے کوئی خاص اعتراض یا مطالبہ نہ ہو گا بشرطیہ ہم والد صاحب کو متفق کر سکیں اور یہ ایک کٹھن کام ہے بہرحال جب والد صاحب رضامند ہو گئے تو آپ کو اطلاع کروی جائے گی اس صورت میں آپ کے والد صاحب رسمی طور پر پیغام پیش کر دیں جیسے کہ دستور میں چونکہ اس میں میری تو چند احوال حیثیت نہیں یہ کام والدہ اور والد سے متعلق ہے اس لئے خصوصاً یہ ایک رسمی آداب بر تناضر و رہو گا۔“

”جی،“ ایلی نے خوشی کی ایک رو روڑتی ہوئی محسوس کی
”کل شاید اماں آپ سے ملنا پسند فرمائیں،“ منصر نے کہا وہ رک گیا پھر خدا حافظ کہتے ہوئے بولا۔

”اب آپ کو مطمئن ہونا چاہیے اور ہاں دیکھئے اگر آپ سے ایسی ویسی بات سرزد ہو گئی تو وہ الٹا نقصان کامو جب ہو سکتی ہے۔ یہ میرا دوستانہ مشورہ ہے۔“

کبوتر یا کوا

اگلے روز جب ایلی سفید منزل میں پہنچا تو اماں اس کا انتظار کر رہی تھی وہ جان بو جھ کر ایسے وقت وہاں پہنچا تھا جب منصر فتح گیا ہوا تھا۔

اماں اسے بڑی محبت اور شفقت سے ملی۔ بات بات پر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے اور وہ کمال محبت سے کہتی تم نہیں جانتے بیٹا مجھے اپنی بیٹی سے کتنی محبت ہے وہ گھر کی لاڈلی بھی ہے اور تم بھی مجھے اتنے ہی پیارے ہو جتنی کوہ ہے لیکن وہ رک گئی۔

”تمہیں کیا معلوم کہ بیٹیوں کی بات کیا ہوتی ہے اگر میری بیٹی کو تکلیف ہوئی تو میں توجیتے جی مر جاؤں گی۔ میرا دل ڈوب جاتا ہے اس خیال پر اس روز جب امان آگیا تھا تو ہے چار روز میرا دل بیٹھا رہا۔ دل سے ہول نہ جاتا تھا اگر کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا“

عین اس وقت دروازے سے آواز آئی ”اماں تو ہے یہی غم کھاتی ہیں۔ جو کچھ بھی بیتے گا اماں ہم دونوں پر بیتے گا“ سادی سامنے آ کر ہنسنے لگی ”کیوں الیاس صاحب؟“ اماں اسے دیکھ کر گھبرا گئی ”نہ بیٹی تو نہ آویسے پر وہ ورده کی تو میں قائل نہیں لیکن سب بھائی برانتے ہیں تو کیا فائدہ“ وہ اٹھ کر سادی کی طرف بھاگی

”اچھا تو الیاس صاحب کل رات بڑی چالاکی سے روٹی پر پانی کا گلاں انڈیل دیا۔ بڑے چالاک ہیں آپ“ سادی قہقہہ مار کر ہنسنے لگی ”اماں کل باجی نے الیاس صاحب کے لیے جو روٹی پکائی تھی نا اس میں دبایا کرنگ ٹھوںس دیا تھا“ وہ ہنسنے لگی

”تم ایسا کو وق کرتی ہو، اماں نہیں

”کیوں نہ کریں“ سادی قہقہہ مار کر ہنسنے لگی ”یہ تو صرف آپ کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے ہیں۔“

اوپرگ سے باجی چلائی ”اماں میں نے نہیں ڈالا تھا روٹی میں نمک سادی نے خود ڈالا تھا۔“

سادی قہقہہ مار کر نہیں پڑی ”میں نے سوچا کہ الیاس صاحب کھائیں گے تو کچھ بھی نہیں شرم کے مارے اگر میں نمک ڈال دوں تو کیا حرج ہے۔ شرماتے بہت ہیں

دیکھ لجئے اس وقت بھی، وہ ہٹنے لگی

”اے ہے کیوں پنجے جھاؤ کر اس کے پیچھے پڑی ہوتم“ اماں بولی

”بہت درد ہے آپ کو الیاس صاحب کا“ سادی نے کہا

”کیوں نہیں“ اماں بولی

”لیکن اماں یہاں کی شرم جو ہے خالص ہاتھی دانت ہے یہ کیوں صاحب“ وہ الیاس سے مخاطب ہو گر بولی

”کبھی تو چ بھی بول دکھائے آپ کو موقعہ رہے ہیں تم“

”یعنی مجھے راست اونی پڑا آ ما دہ کیا جا رہا ہے“ ایلی ولی زبان سے بولا

”نہیں نہیں نہیں“ صادی چیختنے لگی ”معانی معانی“ اور وہ قہقہے مارتی ہوئی اوپر چل گئی۔ سادی کے جانے کے بعد اماں پھر بیٹھ گئی اور ایلی سے باتیں کرنے لگی۔

جب وہ منصر کے علی پور جانے کے متعلق بات کر رہی تھی تو سادی پھر درمیان میں آدمیکی اور معلوم ہے اماں علی پور میں الیاس صاحب کبوتروں کے ڈربوں میں رہتے ہیں۔ وہ قہقہہ مار کر ہٹنے لگی۔ بھائی کہتے تھے ویسے تو وہ مکانات مخلوقوں کی طرح ہیں لیکن پرانی وضع کے محلات آج کل ڈربے معلوم ہوتے ہیں اور اماں وہ بولی ”مجھے ڈربوں میں رہنے والے کبوتر بہت پسند ہیں۔ بشرطیکہ اصلیں ہوں اور اصلیں تو سفید رنگ کے ہوتے ہیں نام“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔

”فضول باتیں نہ کیا کر“ اماں ہنسی

”تو الیاس صاحب علمی باتوں کو اماں فضول سمجھ رہی ہیں“ وہ الیاس سے مخاطب ہوئی۔

”میں کوئی الیاس صاحب پر تو فقرہ نہیں کس رہی۔ یہ تو کبوتر نہیں“

”تو خاموش بھی ہو گی یا نہیں“ اماں نے مصنوعی غصے سے کہا

”جیسے بھی آپ فرمائیں ویسے الیاس صاحب کو خصلت تو کوئے کیسی ہے چھین

کے کھاتے ہیں ویسے نہیں۔ کیوں الیاس صاحب ”ساوی بُنیٰ
”کیا ہیں الیاس صاحب“، باجی داخل ہو کر پوچھنے لگی
”اب کیا تو بھی آگئی؟“ اماں نے باجی سے کہا

”میرے آنے میں تو کوئی حرج نہیں“، باجی نے کہا ”البتہ ساوی کو نہیں آنا چاہیے
کیوں الیاس صاحب“

”کیوں مجھے کیوں نہیں آنا چاہیے“ ساوی نے پوچھا

”اماں جان سے پوچھلو، باجی بولی“

”دراصل اس سارے فناوکی وجہ تسمیہ الیاس صاحب ہیں اور دیکھو تو یوں خاموش
بیٹھے ہیں جیسے منہ میں زبان تھے ہو“ ساوی نے کہا

”کوئے بولا نہیں کرتے“ ایلی نے دبی زبان سے کہا ”یہ مینا کا کام ہے“

”جواب دو باجی تم سے کہہ رہی ہیں“ ساوی ہنسنے لگی ”اگرچہ مثال غلط دی ہے
انہوں نے مجھ سے کوئی پوچھتے تو میں کہوں میری پیاری باجی تو جل پری ہے۔ ہائے
اتنی پیاری ہے میری باجی کہ میرا دم نکلتا ہے البتہ کبھی کھاڑک پر گر کر بے ہوش ہو
جائی ہے اور سب ملیا میٹ کر دیتی ہے“ یہ کہہ کر ساوی تھقہے لگاتی ہوئی اوپر کی طرف
بھاگی۔

ساوی کے جانے کے بعد اماں کو خدا حافظ کہہ کر ایلی چلا آیا۔

دل کی بات

جب ایلی علی پور پہنچا تو ہاجرہ اور فرحت کابل سے واپس آچکی تھیں۔ ان کی آمد کی
وجہ سے گھر میں شور شرaba تھا۔ عورتیں آ جا رہی تھیں۔ فرحت اور ہاجرہ دونوں
افغانستان کے متعلق یوں باتیں کر رہی تھیں جیسے ولایت سے ہو کر آئی ہوں ہربات
پر انگلیاں ہونٹوں پر رکھلی جاتیں۔ سینے تھام لیے جاتے ”بے میں مر گئی ایسا“
”ہاں بہن اور سیتو کچھ بھی نہیں“

ان کے واپس آنے کے بعد ایلی کا شہزادی کی طرف رہنے کا کوئی جواز نہ رہا تھا اس بات پر بیگم بے حد سرو تھی۔ لیکن شہزادی کو اس کی مطلق پرواہ تھی اس کے لیے گویا کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ الشاوه دن میں چار ایک مرتبہ اسی طرح دادرے کی چال پرنا چتی ہوئی آتی ”کیوں گھر والو کیا ہو رہا ہے وہ بیدھومیاں کہاں ہے صح سے آیا کیوں نہیں؟“

اب تو فرحت بھی طمع دے دے کر آلتا چکی تھی۔ البتہ محلے والیاں ہاجرہ اور فرحت کے سامنے شہزادے متعلق اشاروں میں باتیں کرتی رہیں چار ایک دن کے بعد ہاجرہ اور فرحت ایلی کے گرد آ کھڑی ہوئیں ہاجرہ بولی ”ایلی ایک بات پوچھوں یعنی بتاؤ گے“ کیا ہے ”ایلی نے کہا

”جانو کہہ رہی تھی کچھ لوگ یہاں تمہارے متعلق تحقیق کرنے آئے تھے“ ایلی کی زبان سے سادی کے خاندان کی بات سن کر فرحت اور ہاجرہ کے خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ”کیا یہ سچ ہے کیا تم چاہتے ہو کہ وہاں بات طے ہو جائے“ کیا واقعی انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ایلی شہزادے کے چنگل سے آزاد ہو سکتا ہے۔

ہاجرہ اور فرحت دونوں شہزادوں غلط سمجھتی تھیں ان کا خیال تھا کہ شہزادے جان بوجھ کر ایلی پر جاؤ کر رکھا ہے تاکہ وہ اس کے ہاتھ کا پنچھی بنارہے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ایلی کو اپنا بنا نے میں شہزادہ کا کوئی خاص مقصد ہے اگر چنانہیں کبھی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ کہ وہ خصوصی مقصد کیا ہو سکتا ہے۔

ایلی کی بات ہی نہیں شہزادے کے متعلق محلے میں عام خیال تھا کہ اسے نوجوانوں کی نگاہوں پر چڑھنے کا شوق ہے ان کا خیال تھا کہ شہزادوں کی کچھ کر محلے کے مردابنے ہوش و حواس کھو دیتے ہیں اور ان کے حواس کھونے کی تمام تر ذمہ داری شہزاد پر ہے۔

فرحت نے سب سے پہلے اس بات کا تذکرہ شہزادے کیا۔ غالباً اس کا مقصد یا تو

شہزاد کو دکھنے پہنچانا تھا اور یا یہ جتنا کہا میں اب اس کے سحر سے آزاد ہو چکا ہے۔

”میں نے کہا شہزاد“ وہ بولی ”سنا ہے یہاں لوگ ایلی کے متعلق تحقیق کرنے آئے تھے“

”ہاں“ شہزاد نے بے پرواں سے جواب دیا ”جانونے بتایا تھا مجھے“

”کیا یہ حق ہے؟“ وہ شہزاد کے قریب تر ہو کر بولی

”پوچھو جاؤ ایلی سے مجھے کیا خبر“ شہزاد نے کہا

”میرا مطلب ہے“ فرحت نے کہا ”ایلی دن کی بات کہ بتاتا ہے“

وہ بنسی ”مجھے دل کی بات بتائے گا کیا؟“

”بالکل“ فرحت بولی

”مجھ سے اتنا ہی لگا وہ ہے کیا؟“ اس نے پوچھا

”ہم تو یہی سمجھتے ہیں“ فرحت نے کہا

”تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے“ شہزاد بنسی

”کیوں؟“

”پھر یہ خبر غلط ہے یہ نہیں ہو سکتا بس نہیں ہو سکتا“ وہ قہقہہ مار کر بنسی

فرحت کا رنگ فتنہ ہو گیا

”دو ہی صورتیں ہیں“ شہزاد ہستے ہوئے بولی ”اگر ایلی کو مجھ سے لگا دے تو مجھ اس

سے پوچھنے کی ضرورت نہیں اور اگر نہیں ہے تو پھر وہ کیوں بتانے لگا؟“

”کیوں ایلی؟“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولی جو ماحقة کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا“

یہ ساتھی نے ”فرحت نے ہاتھ جوڑ دیئے“ ”خدا کے لیے اسے نہ بتانا“

”بتاتی تو نہیں پوچھتی ہوں“ وہ بنسی ”کیوں ایلی؟“ وہ بولی ”وہ لاہور والی جو ہے کیسی ہے وہ؟“

”کیا مطلب؟“ ایلی نے پوچھا

”جس کے عزیز یہاں تحقیق کرنے آئے تھے تھانیدار کے گھر کیسی ہے وہ؟“

”بہت خوبصورت ہے،“ ایلی نے کہا

”مجھ سے بھی زیادہ،“ وہ فرحت کی طرف دیکھ کر باعتی انداز سے بولی

”کوئی مقابلہ ہی نہیں،“ ایلی بولا

”یہی تمہارا مطلب ہے، مجھ سے وہ مقابلہ نہیں کر سکتی،“ شہزادے شرارت سے کہا

”تم تو ہندو ہو،“ ایلی بولا ”تمہارے ماتھے پر بندی ہے“

”اور وہ مسلمان ہے“

”ہاں ہاں“

”مسلمان تو خوبصورتی میں ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیوں فرحت،“ شہزادے

نے کہا

”تو بے فرحت بولی تو تو بات کا بنیلوڑ بنادیتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں ایلی وہ لوگ ہیں کون؟“

”بڑے اچھے لوگ ہیں“

”خاندان کیسا ہے،“ فرحت نے پوچھا

”خاندان کا تو پتہ نہیں،“ ایلی نے کہا ”لیکن سنائے اس کے اباکسی ریاست میں وزیر ہیں“

”ارے،“ شہزادے منہ بنایا ”وزیر“

”بھائی دو ہیں ایک بیرونی ہیں اور دوسرے بڑے عہدے پر ہیں“

”ارے،“ شہزادے پھر منہ بنایا

”تو پھر ہمیں خاطر میں کیوں لانے لگے وہ،“ فرحت بولی

”خاطر میں نہ لاتے تو پوچھ پچھ کیوں ہوتی،“ شہزادے کہا

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے،“ فرحت بولی

”ایلی نے محنت کی ہو گئی اس کا پھل ہے، شہزادے نے کہا ”کیوں ایلی؟“

”میری محنت کو کون خاطر میں لاتا ہے،“ اس نے معنی خیز نگاہ سے شہزادے کی طرف دیکھا۔ ”کوئی مائل بے کرم ہونا چاہیے تو پھر کیا دیگر ہے،“ ایلی ہنسنے لگا

شہزادے نے آہ بھر ”ہم مائل بے کرم ہوں جبھی تو کچھ نہیں کر سکتے“

”لڑکی تو بہت پڑھی کاہی ہو گی،“ فرحت نے فوراً بات کا رخ بدلا

”یو مجھے معلوم نہیں لیکن فارسی دان ہے،“ ایلی نے کہا

”پھر تو وہی معاملہ ہو گا،“ شہزادہ نہیں ”اب آب آب امر گئے بچھنا رہیاں گھر گائے“

”کچھ بھی ہو،“ شہزادے بولی ”فارسی دانوں سے تمہارا آزر ارا مشکل ہی ہو گا،“

”تم اپنی بات کرو،“ فرحت پر پڑھ پڑ گئی

”میرا کیا ہے میں تو پانی ہوں چاہے جبکہورے میں ڈال لو چاہے گلاس میں،“

”جبھی سبیل لگی ہوئی ہے،“ فرحت چلائی

”لیکن ان لوگوں سے واقفیت کیسے ہوئی؟“ فرحت نے ایلی کو مخاطب کر کے پوچھا

”بس ہو گئی،“ شہزادے نے کہا ”اب کیا وہ تمہیں بتاوے گا،“

”تو تم پوچھو ہو،“ فرحت نے کہا

”نه میں نہیں پوچھتی،“

”کیوں؟“

”جو میں نے پوچھا تو اسے بتانا پڑے گا،“ شہزادہ نہیں

”بڑا عزم ہے،“ فرحت نے کہا

”ہے،“ شہزادے بولی ”کیوں ایلی درست ہے نا،“

”ہاں ہاں،“ ایلی ہنسا اور پھر فرحت سے کہنے لگا ”فرحت تو شہزادے سے بات میں پوری نہیں اتر سکتی۔“

”کسی بات میں نہیں اترتی،“ فرحت نے جل کر کہا

”کسی میں بھی نہیں یہ تو بات کی وجہی ہے،“ ایلی بولا

”غلط، شہزاد بولی“ جہاں بات کرنا چاہوں وہاں ہو نہیں پاتی۔ میں تو نہ بات کی وجہی نہ کام کی بے مصرف باتوں میں البتہ ہوں“

کمپارٹمنٹ کے سخنی امتحان میں ایلی کامیاب ہو گیا۔ اب کی بار منصر نے تار کے ذریعے اسے نتیجہ ہے آگاہ کر دیا۔ اس لیے لاہور جانے کا اسے موقع نہ ملا۔

اس دوران میں ہاجرہ اور فرحت ایک بار لاہور جا کر سادی کی والدہ سے مل چکی تھیں۔ ہاجرہ ان لوگوں سے مل کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ ہائے وہ تو بہت ہی اچھے لوگ ہیں اس نے ایلی سے کہا تھا ”امیر بیرون ہوتے ہوئے اتنے سادہ اور ملنسار ہیں وہ، مجھے تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ بات بن جائے گی بہن لڑکی کے ابا سے بات کرنی باقی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ان کی منظوری لینے کے بعد وہ ہمیں بتائیں گے ہے اگر ایلی کے ابا نے بات نہ مانی تو کیا ہو گا۔

ہاجرہ نے لاہور جا کر سادی کی والدہ کے سامنے اپنے تمام حالات صاف بیان کر دیئے تھے جیسے کہ اس کی حادثت تھی۔ اس نے کہا تھا ”بہن ہم تو غریب لوگ ہیں یہ تو آپ کی مہربانی ہے جو ہم پر نظر عنایت کی ہے۔ ورنہ ہماری کیا حیثیت ہے نہ اپنا گھر ہے نہ در ہے ساری زندگی سوکنوں کی خدمت میں گزاری بس صرف لے دے کر ایک ایلی ہے وہی میری امارت ہے اسی پر ساری امیدیں ہیں لیکن بہن آج کل کی اولاد کب امیدوں پر اترتی ہے اپنے اپنے نصیب ہیں نصیب کا کسی سے کیا گلہ باقی رہے ہم تو ہمارا فکر نہ کجھے ہم تو جیسے ایلی کے خادم ہیں ویسے ہی سادی کے سمجھ لیجھے،“

”ہمارے سر آنکھوں پر رہے گی لیکن ہم اس قابل نہیں کہ چاؤ جو نچلے کر سکیں ہم تو خالی خدمت گزاری کر سکتے ہیں،“

جب وہ دلوں لاہور سے واپس آئی تھیں تو شہزاد اور بیگم ان کے گلے کے ہار بن

گئی تھیں ان دونوں کے سوالات ختم ہونے ہی میں نہ آتے تھے ”لڑکی کیسی ہے کتنے بہن بھائی ہیں ان کے ابا کیا کرتے ہیں“ شہزاد کے انداز سے لچپی پیش تھی لیکن ایسا کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ان تفصیلات کو جاننے پر اسے دکھ ہو رہا ہو۔

ایسا کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شادی کے متعلق بیگم کا رویہ ایسا کیوں تھا اسے تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ ایسا کی بیٹی کے گھر سے ٹل جائے گا اور بیگم کے خیال کے مطابق اگر وہ شہزاد کے گھر کی تباہی کا باعث تھا تو اس تباہی سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔ لیکن اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے بات پر غصہ آرہا ہو کہ شہزاد سے عہد و پیمان لرتے کے بعد اب وہ یوں لینا دامن چھارہا ہے اس کی اتنی جرات!

اگلے روز ہی انہیں ایک خط موصول ہوا یہ خط مفترض کی والدہ کی طرف سے تھا۔ جس میں سمجھی طور پر انہیں منصر کے بڑے بھائی رانا کی شادی پر بلا یا تھا۔

جب وہ رانا کی شادی پر جانے کے لیے تیار ہوئے تو شہزاد کہنے لگی ”اے ہے مجھے بھی ساتھ لے چلو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ لڑکی کو دیکھوں“

”لو“ ہاجرہ بولی ”یہ تو اور بھی اچھا ہے کم از کم ان سے بات تو کرو گی“

”مجھے تو بھی اس قسم کی بات کرنا نہیں آتی مشکل میں پڑ جاتی ہوں“

”اماں تو کہیں جاتی ہے تو وہاں دہن بن کر بیٹھ رہتی ہے“ ایسا نے ہستے ہوئے کہا ہر بات میں جی ہاں اور جہاں بیٹھ جائے وہاں سے اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے اسے اس روز پہلا موقعہ تھا جب شہزاد نے اپنی طبعی بے نیازی چھوڑ کر اس قسم کی درخواست کی تھی۔ ایسا کی بات سن کر حیران ہوا تھا اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ سادی کو ملنے کے لیے کس قدر مشتاق تھی۔ شہزاد کو دیکھ کر رابعہ بھی نہ رہ سکی۔ وہ بھی ساتھ تیار ہو گئی۔

جب وہ جانے لگے تو بیگم ان کے ساتھ چل پڑی

”اماں تم کیا ساتھ چلوگی“، شہزادے نے پوچھا

”میں کیوں نہ چلوں“، بیگم بولی

”پیچھے گھر میں کون رہے گا“، شہزادے نے پوچھا

”میں کیا گھر کی ذمہ دار ہوں جس کا گھروائی جائے“

”لیکن اماں تیر اوہاں لیا کام“، شہزادے نے پوچھا

”مجھے واکیٹ کام ہیں لاہور میں سانوری گب سے بلا رہی ہے اسے بھی تو مانا ہے“

اور جب وہ تالک میں نوار ہوئے تو ایلی نے بیگم کی شکل و لیکھ کر محسوس کیا کہ وہ بڑے غصے میں تھی۔ لیکن اس وقت ایلی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے؟

رانا میں اگرچہ منصر کی خصوصیات نہ تھیں لیکن پہلی مرتبہ ہی اسے مل کر ایلی نے محسوس کیا کہ وہ ایک ملنسار اور بتکلف شخص ہے۔

”اچھا تو آپ ہیں ایلی“، وہ اسے دیکھ کر بولا ”ایلی سے میں سمجھا تھا کہ کوئی تیکی قسم کی چیز ہو گی لیکن آپ تو بڑے معقول آدمی معلوم ہو رہے ہیں۔ اور جناب کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں دواہا میاں ہوں جس کے دم قدم سے یہ رونق ہو رہی ہے“، وہ ہنسنے

لگا

وہ ایک بھر پور جسم کا آدمی تھا۔ پر رب چہرہ اکسر تی جسم لیکن اس کے چہرے پر وہ بات نہ تھی جو منصر کی خصوصیت تھی۔

شادی کی وجہ سے سفید منزل میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھمسان کارن پڑا ہو۔ ہر کوئی مصروف تھا سب بیک وقت بات کرتے تھے۔ جسے شاید کوئی نہ سنتا تھا۔ اور اس کے علاوہ بھانٹ بھانٹ کے لوگ آ جا رہے تھے وہ شاید غالباً اس کے رشتے دار تھی۔ ایلی حیران تھا کہ یکدم اتنے رشتے دار کہاں سے آ گئے۔ ایلی کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ

مکان کرائے کا نہیں بلکہ ان کا اپنا ہے۔ لیکن اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ منصر کہاں کے رہیوں والے تھے اگر وہ لاہور کے رہنے والے تھے تو پھر گھر میں سمجھی لوگ اردو کیوں بولتے تھے اور پھر ان کا الجہاں زبان کا سا تھا اور زبان نہایت مہذب اور رشتہ تھی۔ ان حالات میں ظاہر تھا کہ سادی کو دینکرنے یا ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ایلی کی خواہش تھی کہ سادی سے ملے اسے یاد دلانے کے دو پڑھنے کی شرط جیتنے کی وجہ سے اس کی حیثیت فائیکی ہے اور جو حکم وہ دے گا سادی کو اسے ماننا پڑے گا۔ سادی نے خود ہی کہا تھا جو مانگو گے ملے گا۔ اسی ایک دن وہ سوچتا ہا کہ کیا مانگوں دو پڑھ تو لے چکا اب تمیص لینے کا فائدہ؟ ایلی نے اسی بار سادی کا دو پڑھنے ہونا کھا تھا لیکن اس میں سادی کے جسم کی بوندھی اسی تین بیٹھ کی بوانی تھی۔ حالانکہ وہ کئی ایک بار سادی سے ملا تھا لیکن اس نے بھی سادی کے جسم کو بومحسوس نہ کی تھی۔ شہزاد کے جسم کی بوکو محسوس کر کے نہ جانے ایلی کو کیا ہو جاتا تھا اس کی آنکھیں ابلیں آتی تھیں۔

نہیں نہیں تمیض مانگنا بے کار ہے تو پھر کیا مانگوں؟ اس نے بہت سوچا تھا کہ ایک دن کے بعد دلخواہ سے خیال آیا تھا۔ ہاں وہ خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ سادی سے کہوں گا کہ مجھ سے ملے اکیلی ملے گھر سے باہر مقبرے یا شالیمار میں اور کم از کم دو گھنٹے میرے ساتھ رہے۔

ہاجرہ فرحت رابعہ شہزاد اور بیگم کو کوٹھے پر جاتے ہوئے اس نے حسرت سے دیکھا تھا کاش کروہ بھی اوپر جاسکتا۔ شاید اماں اسے بلاعیں۔ لیکن اتنے رشتہ داروں کی موجودگی میں وہ اسے کس طرح بلا سکتی تھیں۔ اماں کو تو شاید اپنا ہوش بھی نہ تھا چونکہ وہ انتظامات میں مصروف تھیں۔ ادھر منصر کو اتنی فرصت نہ تھی کہ ایلی کے پاس بیٹھے اب کی باروہ بالکل ہی محروم رہا تھا۔

رانا واحد شخص تھا جو مصروف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہ اس کی طبیعی خصوصی تھی۔ انتظامات میں تو شاید برابر کا حصہ لے رہا تھا لیکن اس کے رویے سے یوں معلوم ہوتا

تحا جیسے فارغ ہو۔ بے کار ہو، جیسے ازل سے ہی اسے کوئی کام نہ ہو۔ دراصل اس کی طبیعت میں گھبراہٹ اور پریشانی کا عنصر نہ تھا لہذا وہ کام میں مصروف ہونے کے باوجود مطمئن اور فارغ دکھائی دیتا تھا۔

اماں بھی ان کے ساتھ ان نظمات میں مصروف تھا۔ اب کی بارا مان نے ایلی کو دیکھ کر وہ پرانا انداز اختیار نہیں کیا تھا بلکہ جیسے اس نے ایلی کو برداشت کر لیا ہو جیسے اس کے وجوہ کو تسلیم کرنے کے بعد اب اسے ایلی سے کوئی شکایت نہ ہو۔ منتظموں میں وہ معلوم نہیں رہنی تو پی کو دیکھ کر ایلی خھکھ کا پڑا رہے، وہ چلایا "ان صاحب کو تو میں نہ بھیں دیکھا ہے" وہ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اسے یاد آیا۔ آخاہ بھی صاحب تو اس روز پھل کا انورالانے تھے۔ اب بھی رہنی تو پی کا وہی پراسرار انداز تھا جیسے کہیں سے پھل کا انورالانے ہوں اور انہیں وہ انورانہ جانے کے دینا ہو۔

منصر کے باقی بھائیوں میں صرف انور ایلی کے لیے باعث دیکھی تھا۔ اس کی آنکھوں میں بیک وقت شرارت ذہانت اور تمسم کی پھواری پڑتی تھی اب تو ایلی کو علم ہو چکا تھا کہ انور ہی نے سر پر دوپٹے لے کر سفید منزل کے چوبارے سے جمال کو اشارے کیے تھے اور اس طرح ناؤ گھر اور سفید منزل کے باہمی رابطے کا راز فاش ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں سفید منزل کے اوپر زینے میں اینٹوں کے جنگلے بند کر دیئے گئے تھے۔ انور جب بھی ایلی کے قریب آتا تو اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔

شکر یہ شکر یہ

شاودی سے ایک دن پہلے رانا ایلی کے پاس آبیٹھا۔ کہنے لگا "الیاں صاحب کل برات میں کیا آپ شہ بالا بنیں گے"

"شہ بالا" ایلی نے رانا کی طرف استفسار بھری نگاہ سے دیکھا

"شہ بالا کا مطلب" بیٹ میں ہے "وہ بولا

”آپ کا مطلب ہے،“ ایلی نے لگا کر میرا کارلوں بنایا جائے۔“

“

”تو پھر“ ایلی نے پوچھا

”برات سفید منزل سے چلے گی اور موتی محلہ پر جا کر کی جائے گی جہاں ہماری ہونے والی بیکم رہتی ہیں۔ برات کے آگے بینڈ بایا جا ہو گا۔ بینڈ کے پیچھے دو لہا اور شہب بالا ہوں گے اور ان کے پیچھے براتی نہ کوئی بارہ وگانہ سہرا اور بھی لوگ پیدل ہوں گے۔“

”اچھا“ ایس سوچنے لگا مگر

”یہ تو آپ کی مرضی پر متوقف ہے کہ شہب بالا بینڈ یا شہب نہیں میں نے تو بھی تمہارے بھلے کی کہی ہے اگر تمہیں منظور نہیں تو نہیں۔“

”میرے بھلے کی؟“ ایلی نے حیرت سے پوچھا

”ہاں ہاں“

”وہ کیسے؟“

”ایک شہر ا موقعہ ہے اگر فائدہ اٹھانا چاہو تو“ رانا نے شرارت بھری مسکراہٹ سے جملہ مکمل کر دیا

”میں نہیں سمجھا“ ایلی نے کہا

”ویسے بات معمولی سی ہی لیکن صاحب ذوق کے لیے بڑی بات ہے“ وہ کہنے لگا دیکھوں راستے میں جتنی کھڑکیاں اور جھروکے ہیں برات گزرے گی تو وہ سب کھلیں گی جو کھڑکی کبھی نہیں کھلی۔ وہ بھی کھل جائے گی اس وقت اور جو کبھی کھڑکی میں نہیں آئی وہ بھی کھڑکی میں آ کھڑی ہو گی اور دو لہا اور شہب بالا کو دیکھے گی رنگ رنگ کی آنکھیں طرح طرح کی نگاہیں دو لہا اور شہب بالا پر مرکوز ہو جائیں گی۔ صرف یہی نہیں۔ ہر کوئی کوشش کرے گی کہ ان کو صرف دیکھے ہی نہیں بلکہ اپنا آپ دکھائے بھی

اور وہ جب خود اپنا آپ دکھاتی ہیں تو کیا کیا پوز بنتے ہیں کیا کیا پوز رانا ہٹنے لگا ”اپنا خوبصورت ترین حصہ دکھاتی ہیں خوبصورت ترین انداز اگر شہہ بالا بن کر ہمارے ساتھ چلو گے تو لا ہور کی ساری پدغیاں اور نہ جانے کون کون تمہاری نگاہوں کے سامنے ستادہ ہوں گی اور تمہیں اندازہ وہ گا کہ یہاں کیا کیا چیز چھپی پڑی ہے۔ ارے صاحب اف اف“ رانا نے اس ڈرامائی انداز سے جھر جھرمی لی کہ ایلی کے جسم میں ابھی ایک لہر دوڑ گئی۔

”اگر تم صاحب ذوق ہو تو شاید تمہارے لیے کوئی دروازہ ممکن طور پر کھل جائے اللہ برکات کار ساز ہے اور اگر ذوق نہیں تو علمی و پچھلی ہی ہی۔ پندت کو کی کتاب کی تفسیر لکھ سکیں گے آپ“ 2002-2006
یہ کہہ کر رانا یوں کسی کام میں مصروف ہو گیا جیسے ایلی کے فیصلے سے اسے خاص پچھپی ہو۔

وہ اپنی ایک مصروفیت سے ایک ساعت کے لیے فارغ ہوتا اور آ کر ایلی سے مرسری طور پر پوچھتا۔

”کیوں الیاس صاحب کیا فیصلہ کیا آپ نے؟“ اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر ادھر ادھر چلا جاتا اور ادھر سے فارغ ہو کر ادھر آتے ہوئے ایلی کو کہنی مار کر پوچھا ”کیا فیصلہ کیا؟“

نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے روز برات کے جلوس میں ایلی رانا کے ساتھ ساتھ شہہ بالا کی حیثیت سے چل رہا تھا۔ اور قدم قدم پر رانا اسے دلبی آواز میں کہہ رہا تھا ”ادھر بھی ادھر داعیں ہاتھ وہ واہ کیا چیز تھی۔ سبحان اللہ تم نے موقعہ کھو دیا۔ ہئے ہئے حد تھی حد تھی ڈر اچوکس رہو بھائی“

”بھی واہ ادھر تو چاند چڑھا ہوا ہے وہی بات ہے وقت نگ است و کار ہائے بسیار اوہ تم تو بھی اپنے آپ میں کھوئے ہوئے ہو“

الیاس کے روپ و کھڑکیاں کھل رہی تھیں چھپیں سرک رہی تھیں انگلیاں بڑھ رہی تھیں سیاہ نشیلی آنکھیں طاوع ہو رہی تھیں۔ تمیم لہرار ہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سادی چل رہی تھی وہ مسکرائے جا رہی تھی نہ کہہ رہی تھی۔ دیکھ سکتے ہیں تو دیکھ لجھتے اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے دیکھنے کی قوت سب ہو چکی ہو۔ دیکھنے کے باوجود اسے دکھنا نہیں تھا۔ چاروں طرف سادی ہی سادی نظر آ رہی تھی۔ سارے لاہور پر مسلط تھی۔

جب وہ متی محلے کی گلی میں پہنچ تو عفید بازوکاں لہراتی انکیوں منہسم چہروں اور شوخ نگاہوں کا گویا ایک طوفان اٹھا۔
بینڈر ک گیا جلوس تھم گیا رانا کی نگاہیں پھیل جائیں چلا رہی تھیں۔ ایلی میں نہ جانے کیوں گھبراہٹ سی پیدا ہوئی جا رہی تھی۔

سامنے کی ایک کھڑکی میں سادی کی جھلک دکھائی دی وہ مسکرا رہی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ پھیکی اور بے جان تھی جیسے کوئی کھوئی ہوئی ہو سادی تو ایسی نہ تھی۔ ایلی نے کوشش کی کہ وہ جلوس سے نکل کر سامنے کرے میں جا بیٹھے لیکن رانا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”واہ“ وہ بولا ”یہی تو نقطہ عروج ہے اور نقطہ عروج کو چھوڑ کر جانا وہ صاحب“ رانا نے مضبوطی سے اسے پکڑے رکھا اور آنکھوں سے اوپر کی کھڑکیوں کی طرف ہتش بازی چھوڑتا رہا۔

”یہاں تو قیامتیں چھپی ہوئی ہیں۔ طوفان ہیں فتنے ہیں رانا مسکراتے ہوئے بولا“ پھر بینڈ نے سلامی کی آخری سریں فضا میں پھیلا کر باجے ہونٹوں سے الگ کر دیئے اور وہ سحر ٹوٹ گیا۔ اس پر سب کمروں کی طرف بڑھے اور رانا اور ایلی کا ساتھ چھوٹ گیا۔

جب وہ کھانا کھا رہے تھے تو رانا نے ایک لڑکے کو بھیج کر الیاس کو بلا بھیجا۔ الیاس

نے سمجھا کہ شاید رسم کے مطابق اسے دو اہم کے پاس بیٹھنا چاہئے اس لیے وہ باول نخواستہ وہاں چلا گیا اگرچہ مزید نگاہوں پر چڑھنے سے وہ گھبرا رہا تھا۔

”ایسا صاحب“ رانا اس کی طرف جھک کر بولا ”شکریہ شکریہ ایسا صاحب“

”کیوں؟“ ایلی نے پوچھا
”آج بھی تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے جسے میں نمیشہ یاد رکھوں گا،“

”احسان کیا شہزادے بالا بننے کی بات کر رہے ہیں آپ؟“ ایلی نے پوچھا
”ہاں ہاں“

”لیکن اس میں احسان کی کیا بات تھی؟“

”تھی،“ رانا مسکرا کر ایسا 2002-2006ء

”آپ تو کہتے تھے انس میں میر افانگدہ ہے“

”اور کیا کہتے بھائی؟“ رانا نے شرات بھری نظر ایلی پر ڈالی

”میں نہیں سمجھتا،“ ایلی بوکھلا گیا

”بات یہ ہے بھی کہ تم شہر بالانہ بنتے تو ظاہر ہے کہ میرے کسی بھائی کو بنادیا جاتا اور میرے بھائی تم جانتے ہو سبھی خوبصورت ہیں کم از کم مجھ سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ اور جب ان میں سے کوئی برات میں میرے ساتھ ساتھ ہوتا۔ اور دیکھنے والے اسے دیکھتے تو ظاہر ہے کہ اپنی حیثیت تو ختم ہو جاتی لوگ کہتے“ اے ہے دو اہما تو بس اللہ کا فضل ہی سمجھ لو

”لیکن تم ساتھ تھے تو اپنی وہ حیثیت پیدا ہوئی جو شاید کبھی نہ ہو سکتی کبھی نہ ہو سکے تمہارے ساتھ ہونے نے مجھے خوبصورت بنادیا۔ آج وہ دھوم پھی ہے اپنی کہ حد ہے اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا“ راناہنے لگا

”کال کلوٹا،“ سادی سامنے کھڑی نہ رہی تھی

”اور میں سانوری سے کہتی تھی ہے تجھے ایلی میں کیا دکھائی دیا جو تو اس پر ریتھ گئی،“

شہزادہ سو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”تو یہ ہے وہ لڑکا جس کا تم نے انتخاب کیا ہے“ موتی محلے کی کھڑکیوں سے آوازیں آرہی تھیں ”یہ؟“ کوئی ہونٹ نکال رہی تھی ”ارے“ کسی کی نگاہ میں تحیر جھلک رہی تھی تو بے ہے تو بے ہے ڈھونڈ کر پیٹ رہی تھی۔

خوفناک مورٹ

علی پورا پس جانے کے لیے جب وہ نیشن پر پہنچے تو ایلی نے دیکھا کہ بیگم کے چہرے پر فاتحانہ مسکر اہم پھیلی ہوئی تھی۔ بیگم نے تحیر بھری نگاہ ایلی پر ڈالی اور پھر نہ کروں“ تم بھی کیا کرو گے کہ مجھے ساتھ لائے تھے“ ایلی اس کی بات سن گرگبر گیا۔ ایلی اس کی بات سے وہ سکھے بٹھایا ہے کہ یاد کریں گے۔ دھاک جماوی ہے اصفیوں کی، وہ بھی

ایلی کو معلوم نہ تھا کہ بیگم کا وارچل گیا ہے دراصل اس کے ذہن میں یہ بات آہی نہ سکتی تھی کہ بیگم اس نے تعلق کو توڑنے کی کوشش کرے گی اس کا تو یہ خیال تھا کہ بیگم کی کوشش ہو گی کہ ایلی ان کے سر سے ٹل جائے اور اسے سر سے ٹانے کا اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا۔ ان سب افراد میں جو برات پر گئے تھے اگر کسی کا مفاد اس تعلق کو توڑنے سے وابستہ تھا تو وہ صرف شہزادہ ہو سکتی تھی لیکن بیگم۔

ایلی کو معلوم نہ تھا کہ بیگم نے موقع پا کر سادی کی والدہ سے ایسے موقع پر بات کی تھی جب سادی قریب ہی موجود تھی اس نے کہا ”ایلی لڑکا تو اچھا خاصہ ہے لیکن یہ بیل منڈھے چڑھتی دھتی نہیں بہن میں تو سچ کہوں گی لڑکے کو میری اپنی بیٹی سے محبت ہے۔ اس بات کو سمجھی جانتے ہیں۔ تو بے کتنی بد نامی ہے بہن میری بیٹی شادی شدہ ہے یہی جو میرے ساتھ آئی ہے۔ دراصل خون کا اثر نہیں جاتا ایلی کے باپ کو اب تک عورتوں کا شوق ہے چار بیویاں کر چکا ہے۔“

ایلی کو خبر نہ تھی کہ اتنی سی سرسری بات کر کے بیگم نے حالات کا دھارا ہی بدل دیا تھا۔ اس کی زندگی کا رخ ایک ایسے موڑ کی طرف بدل گیا تھا جس طرف بدنامی، رسواںی اور بے عزتی کی مہیب چٹانیں کھڑی تھیں۔

در اصل بیگم کی اپنی زندگی تباہ ہو چکی تھی اور اس کی تباہی کا باعث اس کی اپنی جنسی سرد مہربی تھی۔ اسی وجہ سے جنس سے اسے نفرت تھی براہ راست یا بالواسطہ ہر جنسی تعلق کو توڑنے میں در پر وہ خوشی محسوس کرتی تھی۔

علی پور واپس جاتے ہوئے بیگم ایک سکندر تھی اور ایلی اور شہر او شریف اور سادی تباہ و تاراج شدہ ریاستیں تھیں جو اس کے قدموں میں پھیلی ہوئی تھیں اس کا دل فخر سے دھڑک رہا تھا۔ کیا کیا کرو گے گیا کیا کرو گے کاڑ بجک رفتاری سے علی پور کو چلی جا رہی تھی۔

ہاجرہ کے چہرے پر مسکراہٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ بار بار اپنی ناک کی طرف دیکھتی اور مسکراتی اور پھر ناک کی طرف دیکھنے لگتی۔ فرحت مسرو تھی لیکن اس کی مسرت میں پریشانی اور فکر کا غصہ نمایاں تھا غالباً وہ سوچ رہی تھی کہ بیگم اور رابعہ خود اپنے دکھ میں گم تھی۔ اسی طرح ایک روز اس کی اپنی شادی ہوئی تھی۔ اس کا خاوند محلے میں سب سے زیادہ خوبصورت اور لائق تھا لیکن وہ عیسائی ہو چکا تھا اور اب وہیں لا ہو رہیں ایک میم کے ساتھ زندگی بسر رک رہا تھا اور رابعہ کی گود میں اس کا اکلوتا پیٹا امی تھا جس کے پیدا ہوتے ہی رابعہ کے سہاگ کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ محبت بھرے جذبات سے امی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا نام عما و تھا اسے گھر میں پیار سے سب امی کہتے تھے۔ کب امی بڑا ہو گا۔ لہن بیاہ کر لائے گا اور رابعہ کی زندگی کا آندھیرا دوڑا ہو گا۔ کبھی کبھی رابعہ سر اٹھا کر ہاجرہ کی طرف دیکھتی تو معاً سے یاد آتا کہ وہ کہاں ہے اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور اس کا حسین چہرہ سرفی سے جھلکتا اور وہ کہتی ” ہے کتنے اچھے لوگ تھے کتنے سادہ اور پیار کرنے

والے اور لڑکی تو باتی پیاری ہے کہ خواہ مخواہ اسے اپنانے کو جی چاہتا ہے، "شہزاد اس روز مغموم سی تھی اور خلاف معمول سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔

فرحت اسے کہتی "اے آج سوچ میں کیوں پڑ گئی" ، لیکن شہزاد اس کی بات کا جواب دینا نہ چاہتی تھی۔ وہ پہلا دن تھا جب شہزاد خاموش بیٹھی تھی جواب تو خیر وہ بیسوں دے سکتی تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ خاموش تھی۔ سر اٹھاتی اور کھیانی مسکراہٹ کے بعد پھر سر جھکا کر سوچنے لگتی۔

در اصل بیگم کا انداز دیکھ کر اسے شک پڑ گیا تھا کہ بیگم کچھ کہ کر کے آئی ہے۔ وہ اپنی ماں کی طبیعت سے وافق نہیں وہ سوچ رہی تھی کہ اگر بیگم نے کچھ ایہ دیا اور بات بگزگنی تو وہ سب اس پر شک کریں گے

ایلی اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے بڑی شدت سے کوشش کی تھی کہ سادوی کو پیغام بھیجے اور آخری روز وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ کسی مہمان کا بچہ جو ایلی سے خاصہ منوس ہو گیا تھا اس کے ہاتھ اس نے یہ پیغام بھیجا تھا۔ یاد ہے تم شرط ہار گئی تھی اور جواب میں سادوی جنگل کے قریب کھڑی ہوئی با آواز بلند چلائی تھی "جاوان سے کہہ دو ہمیں یاد ہے اور نہیں اور کچھ نہیں" سادوی کی آواز تو وہی تھی لیکن بات کا انداز بدلا بدلا سا تھا۔ ایلی سوچ رہا تھا نہ جانے کے بات ہے برات کے دن کھڑکی میں بھی وہ غمگین کھڑی تھی اور اس وقت بھی اس کی آواز میں وہ مسرت نہ تھی جس کے چشمے ابلا کرتے تھے سادوی کی ہر بات میں ہر حرکت میں

ایلی کو خبر نہ تھی کہ سادوی کی ادا سی کا راز اس وقت بیگم کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کی صورت میں ظاہر تھا۔ گاڑی کے پیپوں میں گونج رہا تھا "کیا یاد کرو گے کیا یاد کرو گے" دوسرے کھیتوں سے پرے کانگڑے کی سلاٹی چٹانیں کھڑی تھیں۔ اور گاڑی ایلی کو اس مہیب اور خطرناک موڑ کی طرف لیے جا رہی تھی جس کی طرف اب حالات اسے دھکیل رہے تھے بیگم کی وہ فاتحانہ مسکراہٹ بھی تو حالات کا ایک جزو تھی

بے حد اہم جزو اور ایلی اس سے بالکل بے خبر تھا وہ سمجھتا تھا کسی نہ کسی صورت وہ منصر کے گھرانے سے مسلک ہو جائے گا اور اس طرح زندگی کا ایک نیا ورق الثانی جائے گا۔

ہی ہی ہی ہی ہی!

علی پورواپیں آکر ایلی نے دو خط سادی کو لکھے اور غیر از معمولی دونوں سے ایک کا جواب بھی موصول نہ ہوا اس کے باوجود یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی کہ بیاہ سے متعلقہ مصروفیت کے علاوہ بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ ان دونوں خطوط میں اس نے مطالبہ کیا تھا کہ عہدہ پیمان کے مطابق شرط جیتنے کی وجہ سے سادی اسے ملے اور مقبرہ یا شالامار میں چند ایک لگنے اس کے ساتھ رہے۔

وہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ خط سادی تک نہ پہنچے ہوں شاید اس سیلی نے جس کی معرفت وہ خط بھیجتا تھا خطوں کا راز فاش کر دیا ہو۔ شاید وہ لوگ کہیں چلے گئے ہوں شاید اسے کئی ایک خیال آتے لیکن یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ شاید بیگم نے سادی کو ایلی سے تنفر کر دیا ہونے جانے کیوں اسے سادی پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ اپنی نسبت شک کر سکتا تھا لیکن سادی اونہوں جس عظیم کردار کا سادی نے مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی وجہ سے ایلی کو بھی شک نہیں پڑ سکتا تھا کہ کوئی سادی کو ورقا سکتا ہے۔

پھر سادی کا خط دیکھ کر ایلی حیران رہ گیا۔ مضمون پڑھ کر اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ خط سادی نے لکھا تھا۔ پہلے چند ایک جملے نہایت سنجیدہ اور خلک انداز میں تحریر کیے گئے تھے۔ اس کے نیچے پانچ چھلانگیں لکھ کر انہیں کاٹ دیا گیا تھا اور اس قدر احتیاط سے ایک ایک لفظ کا ناگیا تھا کہ یہ اندازہ لگانا ممکن نہ تھا کہ کٹا ہوا حصہ کس بات کے متعلق ہے۔ کئے ہوئے مضمون تلے تحریر تھا ”خیر چھوڑ یے اس بات کو“

اوپر لکھا ہوا تھا

مورخہ 4 ماہ حال کو اس بات کا امکان ہو گا کہ میں آپ سے مل سکوں۔ اس روز

شام کے قین بجے سے پانچ بجے تک آپ بوڑھے دریا کے پل پر میرا انتظار کر رہیں
امید تو ہے کہ میں ضرور آؤں گی لیکن پانچ بجے تک نہ آئی تو سمجھ لجھتے کہ مجبوری کی وجہ
سے رکنا پڑا اس صورت میں پھر اطلاع دوں گی۔

ایلی جیرانت ہا ایسا خط تو سادگی نے بھی نہ لکھا تھا۔ مضمون کا انداز ہی نیا تھا۔ اس
کے علاوہ سادگی نے تو بھی اپنے خط کا ایک لفظ بھی نہ کاٹا تھا۔ وہ بے تکلف اور بے
ٹکان لکھا کرتی تھی اور اس کے خطوط اتنے لمبے ہوتے تھے کہ دیکھنے میں اخبار معلوم
ہوتے تھے، آخر کیا بات تھی جو اس نے لکھ کر کاٹ دی تھی۔ ایلی دیر تک سوچتا رہا لیکن
کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ پھر شاید، اس نے سوچا کہ ملاقات پر ساری بات معلوم ہو
جائے گی اس لیے وہ قیادی میں مصروف ہو گیا۔
لا ہو رجا کر اس نے سوچا کہ شاید اسے دیر تک پل پر انتظار کرنا پڑے اس لیے اس
نے اپنے ایک عزیز کا سائیکل مستعار لے لیا اور پل پر جا پہنچا۔

بوڑھے دریا کے پل پر چند منٹ انتظار کے بعد سادگی کا تانگا اس کے قریب آ
کھڑا ہوا تانگے میں وہ اکیلی تھی۔

سادگی کا چہرہ انہیں اپنے ساط کی وجہ سے گلبے کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ ایلی کو دیکھتے
ہی وہ چلانے لگی۔

”اُرے آپ تو پہلے ہی سے موجود ہیں اور میں بھی میں پہلے پہنچوں گی“

”پہلے پہنچ جاتی تو یہاں کیا کرتی تم،“ ایلی نے کہا

”انتظار اور کیا“

”انتظار کرنے کا بہت شوق ہے کیا،“ ایلی بولا

”شوک کیا کر رہی ہوں اور انتظار نہ جانے کب تک کرنا ہوگا۔ اب تو عادت ہی ہو
گئی ہے،“ یہ کہتے ہوئے اس نے تانگے والے کو پیسے دیئے اور تانگے سے یہ پہ اتر
آلی

”اُرے“، ایلی چلایا ”تاںگا کیوں چھوڑ دیا“

”ہائیں“، وہ بولی ”مجھے خیال ہی نہیں آیا“

”اور بن سوچے ہی کرایہ چکا دیا“، ایلی نے پوچھا

”آپ کو بھی تو یاد نہیں آیا جو پچھے سے لکھ رہے ہیں“، وہ پہنچی

”میں تو خیر مصروف تھا“

”معروف“

”ہاں شدت سے“

”تو میں بھی معروف ہی نہوں گی“، وہ بختنے لگئی

”اب کیا کریں گے ہم نہ جانے کب کوئی حال تائندہ آئے ادھر“

سائکل جو ہے وہ چلائی ”مجھے آگے بھا لجئے“

”ہائیں“، ایلی کامنہ کھلا کا گھلارہ گیا

اس زمانے میں لاہور میں عورتیں خیمہ نما نقاب کے بغیر دکھائی نہیں دیتی تھیں بے نقاب عورتیں اول تو نظر نہیں آتی تھیں اور آتی بھی تو میمیں اسنو انڈیں یا ہندو عورتیں۔ پردے کے رواج کی پاہندی بختی سے کی جاتی تھی اس حد تک کہ نقاب اٹھا کر چلنے بھی معیوب سمجھا جاتا۔

اس دور کے لاہور میں زیادہ تر رونق شہر کی فصیل کے اندر والے علاقوں میں پائی جاتی تھی نگرانی اور سوتی بازار میں شو قین مزاج لوگ شام کے وقت جمع ہو جاتے چونکہ عورت کی بہار دیکھنا کسی اور جگہ ممکن نہ تھا۔ ویسے تو شہر سے باہر انارکلی میں خاصی رونق ہوتی تھی لیکن وہاں سیر و تفریح یا خرید و فروخت کرنے والے صرف مرد ہوتے تھے۔ عورتوں کے لیے اندر وون شہر ڈلبی بازار اور اس کے ماحقة علاقوں میں زیورات اور پارچہ جات کے چند ایک بازار مخصوص تھے۔ انارکلی سے باہر کے علاقے آباد تھے۔ مال روڈ پر سارا دن البوalta تھا شام کو چند ایک گاڑیاں آتی جاتی دکھائی دیتیں یہ

علاقتے صرف گوروں اینگووانڈین اور صاحبو کے لیے مخصوص تھے۔

اس زمانے میں کسی لڑکی کو سائیکل پر بٹھا کر چلنا آسان کام نہ تھا۔ سائیکل پر آگے بٹھانے کی بات چھوڑ دیئے ان دونوں تو اگر کوئی اینگووانڈین لڑکی سائیکل پر سوار دکھائی دیتی تو لوگ آوازے کے تندرے کلاتے۔ سادی کی بات سن کر ایلی چونکا لیکن سادی نہ سرہی تھی بنے جا رہی تھی۔

”بس ڈر گئے؟“ وہ چلانی^{berl}
”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ ایلی نے کہا
”میں بتاتی ہوں، وہ بولی“ اور پھر چدک کر ایلی کے سائیکل کے آگے بیٹھ گئی۔
دیکھا یوں ہوتا ہے اب آپ چلائیے^{rechts rechts}
”لیکن اگر گر گئی تو؟“

”تو اٹھ بیٹھوں گی اور پھر سے سوار ہو جاؤں گی۔ دونوں اکٹھے ہی گریں گے“
ایلی حیرت سے سادی کی طرف دیکھ رہا تھا

راہ گیر انہیں دیکھ کر رک گئے تھے ان کے گرد بھیڑ لگی جا رہی تھی ”ہی ہی ہی ہی“
وہ نہ سرہے تھے لیکن سادی راہ گیروں کی نگاہوں سے گویا بے خبر تھی بے نیاز تھی۔

”چلئے بابو جی میں پہنچا آؤں“ ایک تانگے والا رک کر بولا
ایلی نے ماتحتی نگاہوں سے سادی کی طرف دیکھا
”نہیں،“ سادی نے بار عرب آوازے کہا ”ہم سائیکل پر جائیں گے“

راہ گیروں نے قہقہہ لگایا ہی ہی سڑک گوئختے لگی دور کھڑے پولیس میں نے
انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھا ایلی گھبرا گیا اس بھیڑ میں خصوصاً پاہی سے بچنے
کے لیے اس کی سائیکل ڈول رہی تھی سادی ایک ساتھ چینیں مار رہی تھی قہقہہ لگا رہی
تھی۔ سڑک پر آتے جاتے لوگ ان کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھے۔ کوئی نہ سرہا
تھا ”ہی ہی ہی“ کوئی فقرے کس رہا تھا ”فع کے بابو“ لیکن سائیکل ڈولتی ہوئی

چلے جا رہی تھی

ایلی کو اس وقت قطعی طور پر احساس نہیں تھا کہ سادی کا جسم گویا اس کی آغوش میں تھا اس کے بازو سادی کے گرد جمائل تھے۔ سادی کی پیٹھے اس کی چھاتی سے چھورہی تھی۔ اور سادی سے بینٹ کی بلکل بلکل خوبیوں ہر ہی تھی۔ ایلی کی تمام تر توجہ را گیروں پر مرکوز تھی اسے اتنی فرصت نہ تھی کہ سادی کے جسمانی مس کو محسوس کرے۔ سادی کو بھی یہ احساس نہ تھا کہ اس کا جسم ایلی سے مس ہو رہا ہے۔ اور وہ اس کے آغوش میں بیٹھی ہے۔ اسے صرف اس قرب کا احساس تھا اور وہ اس احساس میں اس حد تک کھوئی ہوئی تھی کہ اسے راہ گیروں کا خیال ہی نہ تھا۔ اسے قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ لوگ ان کی طرف حیرت ہے ویکھ رہے ہیں یا تباخ سے نہ رہے ہیں۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے دوپھے ایک انوکھا گھیل ہمیں رہے ہوں ایک نئے کھلونے کو آزمارہ ہوں۔ وہ سرت سے چھلک رہی تھی، چیخ رہی تھی۔ چلا رہی تھی تھیں لگا رہی تھی۔

ان دنوں وکالت کا فائنل امتحان تھا اور مقبرہ وکالت کے طالب علموں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر جگہ ہر پلاٹ میں ہر بیٹھ پر ہر پودے تسلی طالب علم قانون کی موٹی موٹی کتابیں کھولے مطالعے میں مصروف تھے۔ ان کی آنکھیں پڑھ پڑھ کر چند صیائی ہوئی تھیں۔ چہرے بے خوابی کی وجہ سے سوچ سوچ سے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسیں فکر کی وجہ سے پشکن تھیں۔ قانونی نکات پر بحثیں کرتے کرتے ان کی آوازیں بیٹھے چکی تھیں۔

لیکن سادی اور ایلی کو ان کے وجود کا احساس نہ تھا۔ جب وہ باغ میں داخل ہوئے تو ایلی نے غور سے چاروں طرف دیکھا دو چار ایک پلاٹوں میں چند ایک لڑکے دکھائی دیتے۔ ایلی نے اطمینان کا سنس لیا اور سڑک کے جھیلے سے نکل کر یوں محسوس کیا جیسے باغ صرف سادی اور ایلی کے لیے مخصوص ہو۔ ان چند ایک لڑکوں کا کیا تھا جو دورا پنی کتابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ ایلی کو یہ معلوم نہ ہوا کہ قریب کے پودوں

جھاڑیوں اور پھولوں کے تختوں کی اوٹ میں جگہ جگہ استفسار بھری آنکھیں انہیں دیکھ رہی ہیں۔

باغ کے ایک ویران کونے میں پہنچ کر ایلی نے کلیوں سے لدی ہوئی چنبیلی کی جھاڑی کی طرف اشارہ کر کے کیا "تم ہو ساوی" ساوی نے حسب عادت قہقہہ لگایا "کیوں، وہ بولی" میں کیا جھاڑی ہوں" "چنبیلی پھولوں میں چٹ کپڑی ہے" ایلی نے کہا "اور تم عورتوں میں" "لیکن راہ پلتے کا ہاتھ پکلاتی ہے یہ تو" ساوی مسکرائی "اور تم پکڑی اچھاتی ہو" ایلی نے کہا ساوی نے قہقہہ لگایا "جبھی آپ نے سر دیکھ دیں، وہ خوش سے تالی بجائے لگی۔ چنبیلی کی جھاڑی میں حرکت ہوئی۔ اور چنبیلوں سے ایک سر باہر نکل آیا۔ ایک لمبا گکڑی نما چہرہ چارائیک سفید و انت۔

ایلی گھبرا گیا

"ارے" ساوی نے قہقہہ لگایا " سبحان اللہ" وہ چلانی "ذرائعہ تو نکالیے" سرنے غوطہ کھایا اور بزرگھنیوں میں گم ہو گیا۔ "کون تھا یہ" ایلی نے گھبرا کر پوچھا

لڑو

"کیا معلوم، وہ نہیں جا رہی تھی" "ارے" وہ پھر چلانی ایلی نے مذکر دیکھا۔ ان کی پشت کی طرف آنکھوں کے چار جوڑے ان کی طرف گھور رہے تھے۔ "یہ تو نہیں جھاڑی معلوم ہوتی ہے" وہ ہنسی ایلی نے اس کا بازو پکڑ کر گھیٹنا شروع کر دیا۔ "تم مجھے پٹواو گی" وہ بولی

”کیا مزار ہے گا،“ وہ نہیں

”تماشہ دیکھتی ہو،“

”دیکھتی ہوں کرتی نہیں“

”لیکن وہ تو تمہیں تماشہ سمجھتے نہیں،“

”پڑے سمجھیں اس سے کیا ہوتا ہے“

”ساڑی“ ایں نے سنجیدگی سے پوچھا ”تم ان کی زگاہوں سے گھبراٹی نہیں،“

”نہیں تو،“ وہ بولی ”گنوار اپن سے کیوں گھبراوں“

”مجھے تو ڈر آتا ہے،“ ایں نے کہا

”آپ کا کیا ہے،“ وہ بھی ”آپ تو یوں ہیں جیسے گھبراہٹ میں جان پڑ گئی ہو۔

لیکن ہم سے نہیں گھبراتے آپ“

”تو کیا تم سے بھی گھبراوں“

”کیوں نہیں،“ وہ بولی ”گوری چٹی لڑکی کو دیکھ کر لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول

جاتے ہیں۔“

”اونہوں ان کی بات نہ سمجھے،“ کیوں ایں نے پوچھا

”نہیں،“ وہ نہیں ”جلنے کی کوئی بات نہیں اخلاق مانع ہے،“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“

”وہ بھی ہوتا ہے،“ سمجھ لیجئے مجھے کوفت ہوتی ہے۔

”اور ان کی گنوار زگاہوں سے کوفت نہیں ہوتی،“

”اونہوں،“ وہ ہنسنے لگتی

”یوں یوں دیکھتے ہیں جیسے تم لذو ہو“

”ہوں؟“ وہ نہیں

”ہاں ہو،“ وہ بولا

”تو ہاتھ کیوں نہیں بڑھاتے آپ“
”اونہوں مجھے لڑو سے لچکی نہیں“

”جھوٹ“ وہ چلائی ”سفید جھوٹ“

”کیوں“ ایلی نے پوچھا ”وہ کیسے“
”آپ کے منہ سے تو کسی اور لڑو کی بوا آتی ہے“

”کیا مطلب؟“ وہ بول کھلا گیا

”ہر بات کا مطلب نہیں بتایا کرتے“

”کیوں؟“

”بس سمجھ لیجئے خود بخوبی“

” بتاؤ دو“ اس نے منت کی۔

”نہیں بتاؤں گی نہیں بتاؤں گی“ وہ بولی

”بھاڑ میں جاؤ بھاڑ میں جاؤ“ وہ بولا

”بھاڑ میں گئے تو کئی دن ہو گئے“

”اور جلی نہیں“ اس نے پوچھا

”پربل نہیں گیا“ وہ بولی

”نہ جانے کیا کہہ رہی ہو“

”جائے کوکون جگائے“

وغلتاً ایلی نے محسوس کیا کہ وہ سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔ لیکن ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہزاد کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اسے یہ بات کیسے سمجھ میں آ سکتی تھی۔
اسے یہ خیال بھی نہیں آ سکتا کہ بیگم ماں ہو کر اپنی بیٹی کے خلاف بات کر سکتی ہے۔
وغلتاً ان کے قریب ہی سے چارا یک آدمی مل کر گانے لگے۔

”ہمیں لڑو کھلاو، ہمیں لڑو کھلاو“

”وہ سب مل کر یوں گارہے تھے جیسے تو الگاتے ہیں۔ ان کی آوازوں میں تم خرتھا
لیکن تم سحر کی حیثیت ایسی تھی جیسے آرزو کے تھال پر حرص کے پتے چپڑ کے ہوئے
ہوں۔“

”اُرے،“ سادی حسب عادت قہقہہ مار کر بولی ”ہم تو توالوں میں آگئے“
ایلی نے اوہرا اوہڑ دیکھا سادی کے پیچھے پوتوں کے جھنڈ میں بیٹھے ہوئے پانچ
سات بڑوں کی ٹولی سادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔
”ایاس صاحب آپ بھی لگائیں آواز،“ سادی فرمی
ایلی گھبرا گیا۔
”خدا کے لیے نہ بولو،“ ایاس نے اشارہ کیا۔
”کیوں نہ بولوں؟“
”چلو یہاں سے چلیں،“

”ان بزرگوں کے درشن تو کرلوں،“ وہ ہستے ہوئے بولی
توال قریب تر آگئے ”ہمیں لڈو کھلاو، ہمیں لڈو کھلاو،“
”اُرے،“ وہ مرٹی
توال اور قریب آگئے ”ہمیں لڈو کھلاو، ہمیں لڈو کھلاو،“
”اپنی ماں سے مانگو اپنی ماں سے مانگو،“ سادی تالی بجاتے ہوئے گانے لگی۔
ایلی گھبرا کر چل پڑا۔

ابھی وہ چارا یک قدم ہی چلا تھا کہ توالی کی آوازیں بند ہو گئیں
”ایاس صاحب ایاس صاحب،“ سادی کی آواز سنائی دی ”یہاں آیے،“
جب ایلی قریب پہنچا تو وہ کہنے لگی ”یہ بھائی صاحب آم دے رہے ہیں تھفتا
کھائیں گے آپ۔“
”آم دے رہے ہیں،“

”لذومانگنے سے بات شروع ہوئی تھی آم کھلانے پر ختم ہوا رہی ہے۔ اچھے رہے نا“
وہ فہمی۔

”معاف کیجئے وہ تو یہ مذاق تھا،“ ایک نوجوان جھینپٹے ہوئے بولا

”کہیں یہ آم والی بات بھی مذاق نہ ہو“ سادی نے کہا

وہ سب ہنسنے لگے

حور اور لنگور

پھر وہ دونوں آم چوتے ہوئے باغ میں یوں کھونے لگے جیسے میلے پڑے ہوئے ہوں۔ اور بالآخر ایک بڑا سے پلاٹ میں بیٹھ کر کچیں مارنے لگے۔ سادی بات بات پر نہستی تھے۔ لاتی تالی بجا بجا کر نہستی۔ وہ اپنے آپ میں اس قدر گم تھے کہ انہیں گروپیش کا احساس ہی نہیں تھا انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ دور دور سے طبا اس پلاٹ کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ وہ چپکے سے پو دوں کی اوٹ میں بیٹھ جاتے اور پھر دور بیٹھے ہوئے ساتھیوں کو اشارے سے بلا تے۔ حتیٰ کہ ان کی تعداد انہیں پچھیں تک پہنچ گئی۔ پھر وہ چپکے سے پو دوں کی اوٹ سے نکل کر آئے اور انہوں نے سادی اور ایلی کے گرد چاروں طرف حلقہ بنالیا اور گانے لگے

”پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت“

ایلی نے گھبرا کر ادھر دیکھا اس کا دل ڈوب گیا۔

وہ جھوم جھوم کر گارہے تھے۔ تالی پیٹھ رہے تھے۔ آنکھیں مٹکا رہے تھے۔

”اڑے“ سادی نے مسکرا کر ایلی کی طرف دیکھا

”یہ کیا بد تمیزی ہے“ ایلی نے زیر لب کہا

”وہ تو ہے“ سادی نے کہا ”لیکن کہتے سچ ہیں“

لڑکے سادی کی بات سن کرتا لیاں پیٹھے لگے ”ہیر ہیر“

پھر سادی نے دونوں بازو اونچے کر دیئے۔ دیکھئے بھائی صاحب ”وہ یوں چلانے

لگی جیسے بس میں مٹھائی فروش بات شروع کرنے سے پہلے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چلاتا ہے۔

”سنئے بھائی صاحب“ اس نے دہرا دیا اور پھر رک گئی۔

”یہ بتاؤ مجھے“ وہ بولی ”کہ حور گوان ہے اور نگاون گوان؟“

لڑکوں نے دیکھی اور تعجب سے سادی کی طرف دیکھا اور قبیلہ مارنے لگے۔

”اپنے ان سے پوچھئے“ ایک شوخ نوجوان ایلی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

”کیوں میرے ان صاحب“ سادی ایلی سے مخاطب ہو کر بولی ”آپ کے لیے

نام تو اچھا تجویز کیا ہے ان لوگوں نے“

”لنگور، لنگور، لنگور“ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ ایلی نے محسوس کیا کہ

سادی کے مقابل میں وہ واقعی لنگور تھا۔ اس کی نانگوں میں دم لکھنے لگی۔

”لیکن لنگور ہے کون“ سادی نے پوچھا

لڑکوں نے دایا ہاتھ اٹھایا جس طرف سادی کھڑی تھی اور چلانے ”حور حور“ پھر

بائیاں اور پر اٹھایا اور چلانے لگے لنگور، لنگور پھر وہ ایک ساتھ بار بار اپنے ہاتھ اٹھ کر

چلاتے ”لنگور“ دیر تک وہ سور مچاتے رہے۔ اور سادی قبیلہ لگاتی رہی۔

پھر سادی ان کے ساتھ شامل ہو گئی ان کے حلقے سے ذرا ہٹ کر ایلی کی طرف

اشارة کر کے گانے لگی

”پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت“

لڑکے جوش میں اس کے ساتھ چلانے لگے۔ ایلی چپ چاپ گھاس پر بیٹھا ہوا

دانتوں میں تنگا چلانے جا رہا تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن

اس کے تیور دیکھ کر لڑکوں نے حلقہ اور بھی تنگ کر دیا تھا۔ اس لیے بیٹھنے کے سوا

اس کے لیے کوئی چارہ کارنے تھا۔

کچھ دیر کے بعد جب سادی رخصت ہو رہی تھی وہ بھول گئے تھے کہ سادی ایک

لڑکی تھی نوجوان اور خوبصورت لڑکی۔ ان کی آنکھیں پر نم تھیں۔

”تو آپ جا رہے ہیں“ ایک نے حسرت بھری نگاہ ڈال کر کہا
”ہاں دونوں حوراں ورنگوں“

وہ ہنسنے لگے ”خدا حافظ“ سادوں نے کہا
لپٹن نے جواب میں سلوٹ مارا اور تانگہ چل پڑا نگور پا سیدان پر رکھے ہوئے
سائیکل سے چمٹا ہوا تھا۔

اور وہ

تانگے میں وہ دیر تک چپ چاہی تھی رہی۔ ان نے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر
ان میں ٹھوڑی لیک رکھی تھی اور سڑک پر نکالیں جمائے ہوئے تھی۔

”کس سوچ میں پڑی ہو؟“ ایلی نے پوچھا

”کچھ نہیں“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی

”آخر کیا بات ہے؟“

”کچھ بھی تو نہیں“

”ذریتی ہوں کہ بھائی جان کو پتہ نہ چل جائے“

وہ بُنسی ”کیا فرق پڑتا ہے؟“

”پھر سوچ کیسی؟“

”سوچ کے سواب ہے اسی کیا“ وہ بولی

”کیوں؟“

”خود کروہ راحلا جے نیست“

”پشیمانی ہو رہی ہے“

”اوہ ہوں پریشان ہوں“

”کیوں؟“

”بُس ہوں“ وہ بُنسی

”تم تو بات کہہ دیا کرتی تھی،“ ایلی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا

”نہ کہنے والی بات حائل ہو جاتے تو،“ اس نے حسرت بھری نگاہ سے ایلی کی

طرف دیکھا۔ ”حائل ہونے دو، ایلی بولا“

”اگر آپ نے حائل کر لکھی ہو تو،“

”میں نے،“ ایلی کے سچے سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔

ایلی سوچ رہا تھا۔ نہ جانتے وغطا وہ اس قدر بخوبیہ کیوں ہوئی تھی۔ ایسی تو اس کی

عادت نہ تھی وہ تو ایک انہی ساط کا دھار تھی جو بھی رکان تھا۔

”ضرور کوئی بات ہوئی ہے،“ ایلی نے کہا

”ہوئی تو نہیں،“ وہ بولی ”پہلے ہی سے تھی چلو چھوڑو،“ وغطا وہ بُنسی ”جاوے معاف کیا“

”ارے تو کیا یہ مذاق تھا،“

”ہاں،“ وہ بُنسی لیکن اس کی بُنسی میں خوشی کا غصرنہ تھا

”آپ نے اپنے والد صاحب سے بات کی؟“ سادی نے پوچھا

”نہیں تو،“ ایلی نے جواب دیا

”کیا وہ مان جائیں گے؟“

”پتہ نہیں،“ وہ بولا ”مجھے ڈر آتا ہے،“

”اچھا،“ سادی نے آہ بھری

”کیا یہ ضروری ہے،“ ایلی نے پوچھا

”ہاں،“ وہ بولی ”ان کی طرف سے رسمی پیغام کا آنا ضروری ہے،“

”کیوں؟“

”بڑے خاندانوں کے بڑے بکھیرے ہوتے ہیں اس بات پر لوگ بضد ہیں،“

”اچھا“ ایلی نے کہا ”اور“

ساوی نے اس کی بات کاٹ کر کہا ”میں نے غلطی کی“

”کیا؟“

”میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ اس معاملے میں انہیں مجبور نہ کروں گی“

”کیا دیواریں ہی کھڑی ہوتی جائیں گی؟“

”اونہوں یہ تو دیواریں نہیں، وہ پنسی ”دیوار تو“ وہ رک گئی

”کہونا“

”زبردستی ہے کیا؟“

”ہاں“ ایلی جلال میں آگیا

ساوی نے قہقہہ لگایا

”تمہیں بتانا پڑے گا“ وہ غریباً

”نہیں بتاؤں گی، نہیں بتاؤں گی“ ساوی نے قہقہہ لگایا

”تو جملہ ہی مکمل کر دو“

”اونہوں“

”تمہیں میری قسم“ ایلی نے منت کی ”کیا کوئی دیوار ہے؟“

”ہاں“ وہ پنسی ہے ”آپ کی جانب سے“

”میری جانب سے؟“

”ہاں“

”جھوٹ بکواس کوئی دیوار نہیں“

”اور وہ“ ساوی نے قہقہہ لگایا

”وہ“ ایلی سوچنے لگا ”وہ کون؟ بتاؤنا“ ”جو شیڈ میں وہ بھول گیا کہ اس نے دونوں

ہاتھوں میں سائیکل تھام رکھا تھا۔ اس نے ساوی کا بازو پکڑنے کے لیے ہاتھ

بڑھائے۔ دھڑام سے سائیکل تانگے سے گر پڑی۔ ایلی تانگے سے اتر گیا۔“

ساڈی نے ایک اور قہقہہ لگایا اور پھر چلا کر بولی ”خدا حافظ“ اور تانگا چل پڑا۔ ایلی نے سائیکل سنچالی اور تانگے کو جاینے کے خیال سے اس پر سوار ہو گیا لیکن گرنے کی وجہ سے پیدل خراب ہو گیا تھا۔ اور زنجیر جام ہو چکی تھی۔ وہ سائیکل سے اتر آیا۔ اور پیدل چلتے ہوئے ساڈی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھی۔

خدا حافظ، خدا حافظ! اس کے ہونٹ مل رہے تھے۔

تیکا تیکا

علی پور آتے ہوئے گاری میں ایلی مسلسل سوچتا رہا لیکن اسے سمجھ میں نہ آیا کہ کونی دیوار اس کی اپنی جانب سے حائل تھی۔ وہ ساڈی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ وہی ایک دیوار تھی جو ساڈی اور ایلی کے درمیان حائل تھی لیکن نہ جانے کیوں اس جذباتی تعلق کے باوجود وہ شہزاد کے متعلق محسوس کرتا تھا وہ اسے دیوار نہیں سمجھتا تھا۔ اگر وہ اس موضوع پر غور سے سوچتا تو محسوس کرتا کہ اتنا ساڈی تو بذاتِ خود شہزاد اور ایلی کے درمیان ایک دیوار بن چکی تھی۔ ایک ایسی دیوار جو راستے کی مشکل نہیں تھی بلکہ ایلی کے تھنفیض سکون اطمینان اور خوشی کی دیوار تھی۔ یہ صحیح تھا کہ ایلی کو شہزاد سے بے حد وابستگی تھی لیکن ایلی محسوس کرنے لگا تھا کہ شہزاد کے شادی شدہ ہونے کی وجہ سے ان کے اعلقات صحیت مند نہیں رہ سکتے تھے۔

بہر حال وہ ساڈی کے اس اشارے کو نہ سمجھ سکا۔ اسے خیال بھی نہ آیا کہ کسی نے ساڈی سے شہزاد کی بات کہہ دی تھی۔ اور پھر بیگم کہے یہ خیال اس کے دل میں نہ آیا اگر وہ ساڈی کے اس اشارے کو سمجھ پاتا تو یقیناً وہ ساڈی سے مل کر اسے تمام روئیداد سنادیتا اور ساڈی اپنی خلوص پسندی اور ساڈی کی وجہ سے اس پھانس کو اپنے دل سے نکال دیتی جو بیگم نے انتقام کے جذبے کی وجہ سے اس کے دل میں پیدا کر دی تھی۔ لیکن حالات کا تقاضا کچھ اور تھا۔ مستقبل کے بطن کے واقعات کا رخ کسی اور

جناب متعین تھا۔ ہونے والے واقعات مستقبل کے طن میں چلا رہے تھے اپنی نمو کے لیے بلکر ہے تھے۔

علی پور پہنچ کر جب ایلی شہزاد کے چوبارے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ صدر اور شہزاد ایک جگہ بیٹھے باقیں کر رہے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ سادی کی باتوں کی وجہ سے اس قدر پریشان تھا کہ اسے خیال ہی نہ آیا تھا۔ اس نے صدر کی آنکھ میں گرسنہ چمک کی طرف توجہ نہ دی اور اس نے بھی نہ دیکھا کہ شہزاد اس کی آمد پر گھبرا کر پیچے ہٹ گئی ہے۔

ایلی کو دیکھ کر بیگم فریب آگئی ”تو آجھی آجیا“ وہ بولی

”ہاں“ ایلی نے جواب دیا

”دو ایک روز بھی باہر نہ رہ سکا“ بیگم کی مسکراہٹ میں ظفر کی دھار تھی۔

ایلی نے غصے سے بیگم کی طرف دیکھا
صدر کے چہرے پر چمک انہری
شہزاد جوں کی توں خاموش بیٹھی رہی۔

ایلی بیگم کی بات کا جواب دیئے بغیر فرحت کی طرف چل پڑا۔

علی پور آنے کے بعد ایلی پر صرف ایک دھن سوار تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ علی احمد سے رضامندی حاصل کر لے۔ اس کا خیال تھا کہ ابا اس معاملے میں ضد نہیں کریں گے۔ اسے معلوم تھا کہ علی احمد ہر اس بات کے خلاف ہیں جس میں روپیہ خرچ ہوتا ہے اس لحاظ سے ایلی کی شادی کی بات ان کے لیے ایک مصیبت تھی زبانی بات چیت بھی ناگوار تھی۔ لیکن اخراجات سے ہٹ کر انہیں قطعی طور پر اس بات میں کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ایلی کی شادی کہاں ہوتی ہے یا وہ خاندان کیسا ہے یا اُڑ کی کی ناک اوپنی ہے یا بیٹھی ہوئی۔

اگر ایلی علی احمد سے کہتا ابا جان میری شادی کرو تب یہ تو علی احمد اس بات پر ذرا بھی

چیلیں بہ جنیں نہ ہوتے۔ وہ ان بزرگوں کی طرح نہ تھے جو ایسی بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں اور کھنکار کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ یا آنکھیں نکال کر کہتے ہیں ”شرم کرو پیٹا اپنے منہ سے ایسی بات کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے“

ایسے وقت ان کا رو یہ ایک تماشی بنیں سما ہو جاتا۔

”بہت اچھا“، بہت اچھا وہ نہایت خوش اخلاقی سے کہتے اور پھر اپنی بیویوں کو مخاطب کر کے کہتے ”لو بھی راجو شیم سنا تم نے ایلی کہتا ہے میری شادی کر دو۔ ہی ہی ہی سن لیا تم نے“، وہ تھقہہ مار کر کہتے۔ اس تھقہہ میں تمسخر کا عصر نمایاں ہوتا۔ پھر دفعتاً وہ سمجھیدہ ہو جاتے ۔ لیکن راجو بھی کہتا تھیک ہے۔ اب اس کی شادی کی فکر کرنا ہی چاہئے۔ اب تو جوان ہو گیا ہے اور ایلی تھی پوچھو تو شادی کیا ہے اک روگ ہے۔ راجو سن رہی ہے تو کیا کہہ رہا ہوں میں۔ لیکن تیرے سنبھالنے سے کیا فرق پڑتا ہے سن بھی لے تو کیا سمجھ لے گی میری بات! ہی ہی ہی وہ ہستے۔ لیکن واہ واہ کیا روگ ہے ہزار روگ سے بچانے والا ہزار بری عادتوں سے محفوظ رکھنے والا۔ بس ایک روگ لگا لو ہزار مصیبتوں سے محفوظ ہو جاؤ۔ سن رہی ہو راجو مثلاً تمہارا روگ لگا کر میں ہزار مصیبتوں سے بچا ہوا ہوں۔ ہی ہی ہی وہ ہستے ”ہاں بھی“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر کہتے ”ٹھیک کہتے ہو تم تمہاری شادی فوراً ہو جانی چاہئے۔ لو بھی راجو شیم کر دو شروع تیاری ہم بھی کوئی مناسب لڑکی دیکھتے ہیں ہی ہی ہی وہ ہستے“ راجواب میں کوئی اپنے لیے تھوڑے دیکھتا ہوں اب تو مجبوراً ایلی کے لیے لڑکیوں کو دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ ہی ہی ہی اور دیکھونا ایلی شادی کوئی کھیل نہیں کہ آج تم کہوا اور کل ہو جائے بھی یہ تو بہت بڑا بکھیرا ہے۔ پہلے تنکا تنکا اکٹھا کریں۔ اتنے امیر تو ہم ہیں نہیں کہ ایک دم سب کچھ خرید لیں۔ کوئی زمانہ آیا ہے۔ دل روٹی نہیں چلتی۔ بس تنکا تنکا اکٹھا ہو گا پھر تمہارا آشیانہ بننے گا اور پھر کوئی فاختہ آبیٹھے گی اللہ اللہ خیر سلا۔ لو بھی راجو شروع کر دو آج ہی سے تنکا تنکا جمع کرنا۔ ہی ہی ہی“

وہ بہتے اور بات طاق پر دھری کی دھری رہ جاتی۔

ایلی سوچ رہا تھا کہ اب سے اس انداز سے بات کی جائے کہ انہیں واضح طور پر محسوس ہو کہ اخراجات کا انظام ہو چکا ہے۔ تنکا تنکا اکٹھا ہو چکا ہے فاختہ بھی موجود ہے اور ان سے صرف یہ موقع کی جاری ہے کہ تم کے مقابل فاختہ کو اپنی انگلی پر بٹھا کر لے آئیں اور بینے بنائے گھونسلے میں بٹھا دیں۔ ان صورت میں شاید وہ اعتراض نہ کریں۔

ایلی نے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ اخراجات کو ان پورے کرے گا روپیہ کہاں سے آئے گا رسومات کیسے ادا ہوں گی۔ رکھر کھاؤ کیسے قائم رہے گا۔ یہ باتیں بے حد تکلیف وہ تھیں اور ایسی ناخوش گوارا اور تکلیف وہ باقیں پر سوچنا ایلی کو نہ پسند تھا۔ طبعی طور پر وہ ڈنی فرار کا قائل تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے ابا سے رضامندی حاصل کرے اور وہ ایک بار سادی کے اقرب سے مل کر سمجھی طور پر پیغام پیش کرویں۔ پھر چاہے کچھ ہو یا نہ ہو۔ پھر کے متعلق سوچنے سے ایلی گریز کرتا تھا۔ غالباً وہ سمجھتا تھا کہ اس دوران میں اسے الہ دین کا چراغ مل جائے گا اور جملہ ضروریات پوری ہو جائیں گی یا ایسا نہ ہو سکا تو شام منصر اسے ان رسمی اخراجات سے آزاد کر سکے یا شاید اماں اس کی مدد کرے آخراں نے ایلی کی منگنی بھی تو کی تھی اور کی بھی بڑی دھوم دھام سے تھی۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ بشرطیکہ ابا رضامندی دے دیں۔

اماں کے متعلق ایلی نے بھی سوچا ہی نہ تھا اس کی دانست میں اماں تو اس بات پر بے حد مسرور تھی۔ وہ تو خوش تھی کہ اس کا پیٹا ایک بیاہت امورت کے دام سے نکل رہا ہے۔ اور اماں تو سادی کے ہاں دو تین مرتبہ ہو آئی تھی اگر وہ اس بات پر خوش نہ ہوتی تو بھلا وہاں جاتی ہی کیوں۔ لہذا یہ بات تو طے شدہ تھی کہ اماں اس امر میں اس کا ساتھ دے گی۔

لیکن جب ایلی نے ماں سے بات کی تو وہ حیران رہ گیا۔

”نہ بھی“ وہ بولی ”میں اس معاملے میں نہیں آؤں گی“

”کیا مطلب“ ایلی نے حیرت سے پوچھا

”مجھے بڑی خوشی ہے کہ تیری شادی ہو لیکن میں اس معاملے میں کیسے آسکتی ہوں“
”کیوں“ وہ غصے میں غرایا

”دیکھو نہیں میں نے لکھنے چاہے تو تمہاری منگنی کی تھی۔ اب اگر اس رشتے کو چھوڑ کر
میں دوسری جگہ جانا طہ جوڑوں تو لوگ کیا کہیں گے۔ میرے غریب کیا سمجھیں گے“ پھر
وہ رونے لگی ”میں تو میری ساری امیدوں پر اپنی پھیر دیا۔ لکھنے چاہے
سے میں نے تجھے نامزد کیا تھا اور پھر بالا بالا نہیں تجھے پوچھ کر میں نے بات پکی
کی تھی۔ یاد ہے تجھے قسم کی خوشی سے بال کہاں تھا لیکن اب“ وہ خاموش ہو گئی
اس کے گاؤں پر آنسو یوں بہنے لگے جیسے جھٹری لگی ہو۔

”تو کیوں جی رہا کرتی ہے اماں“ فرحت بولی

”جی رہا“ وہ رونے لگی ”میرا دل تو اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ایک اس کی امید
رچائے بیٹھی تھی۔ اس کو دیکھ کر جیتی رہی۔ خاوند کی بے رثی برداشت کی سوکنوں کی
خدمت میں لگی رہی۔ زندگی بھر مخت مزدوری کر کے اسے پالا“ ہاجرہ کی پچھلی بندھ
گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے ہاجرہ کے آنسو اس کے آشیان کے بیٹھے ہوں جو بہنے جا
رہے ہوں۔

گھبرا کروہ اٹھا اور اپنا غصہ اور افطراب چھپانے کے لیے سوچے تجھے بغیر زینہ
چڑھنے لگا۔

شہزاد کے چوبرے میں پہنچ کروہ ٹھٹھ کا شہزاد کھڑکی میں تھی جس کے قریب ہی
صفدر کے چوبارے کی کھڑکی تھی۔ اور وہ دونوں نہیں رہے تھے۔ چپ چاپ وہ کھڑا
انہیں دیکھتا رہا۔

دفعاً صدر کی نگاہ ایلی پر پڑی ”آئیے آئیے“ وہ چلایا ”الیاس صاحب آئے ہیں“ شہزادے نے مژکرا میں کی طرف دیکھا اور پھر منہ موڑ کر صدر سے باقی کرنے میں مصروف ہو گئی۔

”نه“ وہ بولی ”مجھے اس ڈیناں کے بندے پسند نہیں مجھے تو کوئی نے فیشن کا نمونہ دکھاؤ اتنے روپے بھی خرچوں اور پھروہی و قیانوی چیز کام کرنا ہے تو دل سے کرو ورنہ کیا فائدہ“ وہ ہٹنے لگی۔

”بہت اچھا“ صدر نے دونوں بازواٹھا کریوں کہا جیسے حافظ خدا تمہارا گاتے ہوئے سٹچ سے باہر جاریا ہوا اور وہ چلا گیا۔

شہزاد فارغ ہو کر چوبارے میں اوہ راہ رکھو ملتے گئی جیسے پچھے تلاش کر رہی ہو دو دھن پتیں بھی پر کپڑا دیا۔ کارنس پر پڑی سرے والی گواہ کی طرف دکھا صندوق کھول کر تکمیل کا غلاف نکالا۔ اسے سرہانے پر چڑھایا اور پھر تیل کی کچی اٹھا کر مشین کو تیل دینے لگی۔

ایلی چپ چاپ اسے دیکھتا رہا دیکھتا رہا اور پھر مایوس ہو کر نیچے اتر آیا۔
مسٹر گپتا

جن دونوں ایلی نے بی اے پاس کیا تھا وہ مالی بحران کے دن تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے سانپ کو گزرے سالہا سال گزر چکے تھے۔ لیکن لکیریں اب بھر رہی تھیں۔ ہر مجھے میں تخفیف کا کلہاڑا اچل رہا تھا نوکری حاصل کرنا ممکن تھا۔

مجبوری میں ایلی نے ایک شارٹ ہینڈ کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہ کالج علی پور کے لاہوری دروازے کے قریب ایک چوبارے میں واقع تھا جس کے ملحقہ مکان میں مسٹر گپتا کالج کے مالک اور واحد انسٹرکٹر کی رہائش تھی مسٹر گپتا پرانی وضع کے باعزت لالہ جی تھے۔

وہ صح سویرے جا گئے اور چھڑی لے کر باہر چھل قدمی کے لیے نکل جاتے۔ مسٹر

گپتا چھڑی سہارے کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کی چال اس قدر چست اور تیز تھی کہ چھڑی معاون ثابت ہونے کی بجائے الثار کا وٹ معلوم ہوتی۔ لیکن مسٹر گپتا چھڑی یا چھتری کے بغیر باہر نکلنے کے قائل نہ تھے۔ وہ ایک پرانے باعزت خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے آبا اور جداؤ میں کسی شخص نے چھڑی یا چھتری کے بغیر باہر نکلنے کی حماقت نہ کی تھی۔ سیر کرنے کے بعد وہ مندر سے ہوتے ہوئے سید ہے اپنے کالج میں پہنچتے۔ اپنے شاگردوں کو دونوں ہاتھ جوڑ کر پر نام کرتے اور پھر انہیں پڑھانے میں مصروف ہو جاتے۔

مسٹر گپتا اس بات پر بے حد تازگتے تھے کہ ہندوستان میں صوتی شارٹ ہینڈ کو چلانے کے لیے انہوں نے ساوی عمر جدہ یجہد کی تھی۔

جب کوئی نیا لڑکا کالج میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آتا تو مسٹر گپتا اپنی ساری مصروفیات چھوڑ کر اس کے پاس بے کمال شفقت آہنگتے اور اسے سمجھاتے کہ شارٹ ہینڈ کا مر وجہ سٹم جسے پٹ میں کہا جاتا تھا بالکل بے کار ہے اور ان کے نئے سٹم کا مقابلہ نہیں کر سکتا چونکہ ان کا سٹم جائٹ واول سٹم ہے۔

مسٹر گپتا بڑی محنت سے نئے لڑکوں کو سمجھاتے کہ جائٹ واول سٹم کا کیا مطلب ہے اور فونٹیک سٹم سے کیا مراد ہے اور پھر جب لڑکا داخل ہو جاتا تو پھر بات بات پر اسے تاکید کرتے کہ لکھتے وقت وہ سپلینگ کا خیال رکھتے۔

ایلی ان کی اس بات پر بے حد مخطوظ ہوتا اور بڑی سنجیدگی سے پوچھتا ”کیوں مسٹر گپتا یہ سٹم صوتی ہے نا یعنی اس میں صرف آواز کا خیال رکھا جاتا ہے“

”بالکل بالکل الیاس صاحب بس اس فکر کو آپ ہی نے سمجھا ہے لڑکے توجہ سے بات نہیں سنتے۔“

”درست“ ایلی کہتا ”لیکن ہمیں سپلینگ کا خیال رکھنا چاہیے“ وہ طنز آکھتا

”بالکل“ وہ خوشی سے چلاتے ”بس یہی ایک نکتہ ہے“ اور پھر وہ فوراً مثال دیتے صحیح جو آپ نے بے اوغلط لکھا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے لفظ کے سپلینگ کی طرف خیال نہ کیا آپ کو یہ خیال نہ رہا تھا کہ یہ لفظ جے اوسے لکھا جاتا ہے۔ آپ نے یوں لکھا جیسے یہ لفظ جے کے لکھا جاتا ہو۔

مستر گپتا سے باقاعدہ لرنے میں ایلی کو بہت لطف آتا تھا لہذا وہ اکثر مستر گپتا کے ہاں جا بیٹھتا بلکہ سبق لیتے ہوئے بھی وہ مستر گپتا سے گپ بازاں کیا کرتا۔ کانج میں ایلی واحد طالب علم تھا جسی سے مستر گپتا نے دوستانہ مراسم پیدا کر رکھے تھے اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ایلی بیانے تھا اور مستر گپتا کے کانج میں تمام طلباء میڑک پاس تھے۔

دفعتاً محلے میں شور اٹھا کر ایلی کی منگنیر شرہ کی شادی ہو رہی ہے۔ ہاجرہ یہ سن کر حیران رہ گئی وہ بھاگی گئی پوچھ چکھ کی بات کی تصدیق ہو گئی تو ٹھنڈی ہو کر بستر پر آ پڑی۔

اس پر ایلی اماں کے پاس آ بیٹھا بولا ماں اب تو تمہارا یہ اعتراض بھی دور ہو گیا۔
چل اٹھا ب میرے ساتھ چل کر مظفر آباد میں ابا سے ملیں شاید وہ ماں جائیں۔
ہاجرہ نے جب ایلی کی بات سنی تو پہلے تو وہ ادھرا دھر کے بھانے بناتی رہی لیکن ایلی نے بار بار اماں کی منتیں کیں حتیٰ کہ ایک روز اماں ایلی کے ساتھ مظفر آباد کے لیے مان گئیں۔

ماں اور بیٹھا ملتان پہنچ تو انہیں معلوم ہوا کہ سیلا ب کی وجہ سے مظفر آباد کی لاکن ٹوٹی ہوئی ہے اور وہ آگے نہیں جا سکتے۔ مجبوراً وہ ملتان ایک رشته دار کے ہائی ٹھہر گئے اور انتظار کرنے لگے کہ کب راستہ صاف ہو اور وہ منزل مقصود پر پہنچیں ملتان کے قیام کے دوران میں ایلی روز ماں کو باہر لے جاتا اور کسی باغ یا میدان میں پہنچ کروہ دونوں کسی ویران کونے میں بیٹھ جاتے اور ایلی ماں کو سمجھاتا کہ علی احمد سے کس طرح

بات کی جائے۔

”دیکھوں اماں“ وہ کہتا ”اگر اب انے محسوس کیا کہ شادی پر بہت خرچ اٹھے گا تو وہ کسی نہ کسی بہانے یہ رشتہ نا منتظر کر دیں گے اور اگر یہ موقعہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر شاید کبھی ایسا موقعہ نہ ملے اور اماں سادگی ایک ایسی نا ہے جو مجھے اس بخور سے باہر نکال سکتی ہے جس میں میں غوبے کھارہا ہوں اور اگر یہ ناوجہی نہ رہی تو پھر پھر تم جانتی ہو“ ایسی وضاحت سے ہاجردہ کوئی سمجھا رہا تھا کہ اگر وہ ناکام رہا تو پھر وہ اپنے آپ کو از سرفرازی بخور کے حوالے کروئے گا جس میں وہ عرصہ دراز سے ڈیکیاں کھارہا تھا۔

اس روز پہلی مرتبہ ایک لائٹ پنے منہ سے یہ تعلیم کیا تھا کہ شہزاد ایک بخور تھی اور وہ اس بخور میں ڈیکیاں کھارہا تھا۔ وہ حقیقت وہ اس حقیقت کو تعلیم نہیں کر رہا تھا بلکہ اسے استعمال کر رہا تھا اور دھمکی کے طور پر بلوڑی مال کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

لیکن ہاجردہ بار بار کہتی اگر تمہارے ابا نے شادی پر خرچ نہ کیا تو کرے گا کون اور بات کیسے بنے گی۔

”تم اس بات کی پرواہ کرو اماں یہ بعد کی بات ہے فی الحال ضروری بات یہ ہے کہ ابا جان چلیں اور ہمیں ان کی صرف اس قدر امداد حاصل ہو جائے کہ وہ سادگی کے ابا سے مل کر پیغام پیش کر دیں۔ اس لیے بات اس انداز سے کرنا چاہیے کہ وہ سمجھیں خرچ و ریچ کا سلسلہ نہ ہو گا۔“

”لیکن پھر شادی کیسے ہو گی کیا وہ تمہیں خانہ دا مادہ بنائیں گے“
”نہیں اماں!“

”ایسی بات ہے تو میں جیتے ہی مر جاؤں گی“ ہاجردہ چلاتی اور بات جوں کی توں اذہوری رہ جاتی۔

چار ایک روز کے بعد بصد مشکل گھٹنے گھٹنے پانی سے گزر کروہ مظفر آباد میں علی احمد کے مکان تک پہنچے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر علی احمد کے گھر میں شوریج گیا راجو

اور شیمیم ہوٹوں پر انگلیاں رکھے حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ شیمیم کی دونوں پیٹیاں اور راجو کے پہلے خاوند کا بیٹا سب سورج مچانے لگے۔

”ہے آپ ہیں۔ یا میری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے۔“

”خیر تو ہے۔“ راجو بولی۔

”تو یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری۔“ شیمیم نے ایسی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اے سنا آپ نے۔“ راجو نے علی احمد کو مخاطب کر کے کہا۔ سنتے ہیں کیا کہہ رہی ہوں میں ہے اُنگلے اس حساب کے کے رجسٹر کو ہر وقت اسی میں کھوئے رہتے ہیں آپ۔ نہ آئے کاپیٹ نہ لگے کاہوش۔ میں نے کہا آپ سے ہمہ رہی ہوں۔“

”مجھ سے کہہ رہی ہو پچھرا جو تو، اندر سے علی احمد کی آواز سنائی دی۔

”شکر ہے سن لیا آپ نے۔“ وہ بولی۔

”ہی ہی ہی۔“ وہ بنے۔ ”وہ دیکھو نا راجو یا تو یوی گوںگی ہو اور یا خاوند بہرہ ہو جبھی صحیت ہے ورنہ میں تم تو طوطے کی طرح ٹیس ٹیس کرتی رہتی ہو اب میں بھی بہرہ نہ بنوں تو سمجھے کیسے۔ ہی ہی ہی۔“ وہ بننے لگے ”کیا کہتی ہے۔“

”میں کہتی ہوں۔“ راجو چلاتی۔ ”ذریبا ہر تو دیکھو لو کون آیا ہے۔“

”کوئی آیا ہے کیا؟“ وہ بولے۔

”ہاں ہاں کہہ جو رہی ہوں۔“

علی احمد نے جلدی سے ٹنگی ہوئی قمیض کو اتارا اور اسے پہننے لگے ان کی عادت تھی کہ ہمیشہ قمیض اتار کر بیٹھا رکتے اور کب کوئی آتا تو فوراً قمیض پہن لیتے۔

انہیں قمیض پہننے دیکھ کر راجو ہنسی۔ ”اے ہے کوئی باہر سے تو نہیں آئی کی قمیض پہننے لگے ہا جرہ آئی ہے۔“

”ایں کی ماں۔“ انہوں نے حیرت سے کہا۔

”ساتھا ایں بھی ہے۔ اچھا کیا۔ بہت اچھا کیا جو آگئے۔ بھی راجو انہیں بٹھاؤنا

کوئی چائے وائے پلاو بسکٹ و سکٹ منگوادو کالے کی دوکان سے لیکن بھی تم نے پہلے اطلاع نہیں۔

اور یہ سیاہ کیسے پہنچے تم۔ سناء ہے ریل کی لائن ٹوٹی ہوئی ہے اور سارا شہر تو پانی میں ڈوبا ہوا ہے وہ دو فٹ پانی کھڑا ہے پہلے اطلاع دیتے تو ہم کوئی انتظام کر دیتے۔ خیر خیر اچھا کیا تم نے جو آگئے۔ راجو راجو یہ دیکھا تم نے ایلی کی ماں کو۔ ذرا غور سے دیکھو۔ اب تو بالکل بوڑھی ہو گئی ہے۔ اور راجو تمہیں معلوم ہے۔ ہی ہی ہی۔ ایک مرتبہ ہماری پڑو سن نے کیا کہا تھا، وہ ہنسنے لگے۔ ایلی کی ماں سے اللہ رکھ کے کافی کتنے لڑکے ہیں تھے اور یہ پوچھی کا ہے۔ ہی ہی ہی، وہ ہنسنے لگے۔ پھر میری طرف اشارہ لڑکے بھلی اللہ رکھے۔ ”کیوں ایلی کی ماں یاد ہے تجھے۔ ہی ہی ہی ہی حد ہو گئی ساتھ نے راجو۔ ہی ہی ہی۔“

جب علی احمد کو معلوم ہوا کہ وہ ان سے ایک اہم بات کرنے آئے ہیں تو دعا وہ سمجھیدہ ہو گئے۔ علی احمد کی پرانی حادثت تھی۔ اگر انہیں کسی بات میں خاص اہمیت دی جاتی تو وہ اس بات کو خاص اہمیت دینا شروع کر دیتے اور خود اپنی رائے کو اہمیت دینے لگتے۔ اور اس کے عکس کسی مسئلے میں انہیں نظر انداز کرو یا جاتا تو وہ اس مسئلے کو قطعی طور پر اہمیت نہ دیتے اور اس نظر اندازی کو درخواست نہ سمجھتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

علی احمد نے سوچا کہ یہ لوگ اتنی دور سے چل کر آئے ہیں۔ تاکہ مجھ سے بات کریں ظاہر ہے کہ مجھ سے بات کرنے کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے تو بات اتنی آسانی سے طے نہیں ہو جاتی چاہئے۔

”ہاں ہاں ہاں ہاں۔“ وہ ہنسنے لگے۔ ”بھی اب جو تم یہاں آپنچھے ہو تو اب باقی ہی ہوں گی نباتوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے اپنوں کے درمیان۔ ہی ہی ہی۔ اب دیکھ لورا جو ہے تو سارا دن راجو سے باقی کرتے ہیں ہم۔ کیوں راجو ٹھیک ہے نا ہی ہی

ہی ہی۔ یہ اور بات ہے کہ راجو بھی جواب نہیں دے سکی لیکن کمال یہ ہے کہ لا جواب بھی نہیں ہوتی۔ کیوں راجو ہی ہی ہی۔“

”آپ میری بات چھوڑیں۔“ راجو بولی۔ ”ان سے بات کریں اتنی دور سے آئے ہیں یہ بات کرنے کے لیے۔“

”ان سے بھی کریں گے ان سے بھی کریں گے۔ لیکن ابھی یہ لوگ سفر کر کے آئے ہیں اور پھر اتنی تکلیف محیل کے۔ انہیں چار ایک دن آرام کرنا چاہئے۔ آرام کرو کھاؤ پھر بات بھی ہو جائے گی۔“ کیوں راجونامہ نے چائے بنائی اور کیا کالے سے سکن مٹاوازے پھر کوئی خاطر تواضع کرو ان کی تمہارے مہمان آئے ہیں۔ ”یہ کہہ کر انہوں نے اپنی صندوقی سے ایک چوپانی نکالی اور راجو کو دیتے ہوئے بولے۔“ مغلوا و سکن۔ ذرا جلدی لردا جسی ایلی کی ماں بیٹھ جاؤنا۔ اچھا تو علی پور کا کیا حال ہے۔“

مسلسل چار روزہ باجرہ اور ایلی نے متعدد بار کوشش کی کہ علی احمد سے بات کی جائے لیکن وہ بات کی اہمیت سے اس حد تک واقف ہو چکے تھے کہ انہوں نے کسی نہ کسی بہانے بات ٹال دی ایلی بات شروع کرتا تو علی احمد کہتے اوہو۔ میں بھول ہی گیا۔ دیکھوں اتنے بکھیرے ہیں کہ میں بھول جاتا ہوں۔ ہی ہی ہی۔ سب سے بڑا بکھیرا تو یہ راجو ہی ہے۔ کیوں راجونامہ نے کیا کہہ رہا ہوں میں۔ ہونا تم بکھیرا۔ بکھیرے درود ہوتے ہیں اور درود ل والے بکھیرے کا تجربہ نہیں ایلی۔ بڑا عظیم بکھیرا ہوتا ہے یہ۔ تو بہے۔ اچھا ہے اچھا ہے ابھی یہ درود والے بکھیرا۔ یہ بیماری کچھ اور درینہ لگے تو بہتر ہے۔ کیوں راجونامہ نے ہی ہی ہی۔“

اس طرح وہ مسلسل باتیں کیے جاتے اور ایلی کی بات پس پشت پڑ جاتی۔ کسی وقت وہ جواب دیتے۔ ”ہاں ہاں بھی آج تو بات ضروری کرنی چاہئے

انتہے دن ہو گئے ہیں تمہیں آئے ہوئے لیکن بھی میں تو جا رہا ہوں و پڑی صاحب کو ملنے کے لیے۔ انہوں نے بلا یا ہے۔ بے چارے بڑا خیال رکھتے ہیں بات بات پر مشورہ کرتے ہیں۔ ان سے مل آؤں میں پھر اطمینان سے بات کریں گے۔“

اس کے بعد دیر تک وہ جوں کے قول بیٹھ رہتے۔ وہ ڈپٹی صاحب کی طرف جاتے ہی نہ تھے اس لیے بات کرنے کا سوال ہی [یدانہ ہوتا۔ اور اگر ایلی انہیں یاد دلاتا کہ آپ تو جا رہے تھے ڈپٹی صاحب کی طرف تو وہ نہ کر رکھتے ہاں ہاں بھی جا رہا ہوں۔ اور پھر بیٹھ رہتے۔ اس طرح ایلی اور ہاجردہ کو وہاں بہتے آٹھ روز ہو گئے۔ اور ان آٹھ روز میں ایلی صبر و سکون ریزہ ریزہ ہو گئی۔ ایلی بعی طور پر مزاج اور مزاجیہ صورت حال کو مجھوں لئے کو رکھا۔ وہ علی احمد کی رنگیں شخصیت، ان کے انوکھے انداز اور پر کیف انداز گفتگو سے محفوظ نہیں ہوتا تھا۔ وہ انہیں بیٹھے کی حیثیت سے دیکھتا اور اپنے مقاصد کے زاوے سے ان کی باتوں پر غور کرتا۔ اس لیے یہ تمام رنگیں اس کی نگاہ میں دنیا داری مکفریب چالا کی کے مترا دف نظر آتی۔ اسے ان کی ہر بات ہر غصہ آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ باپ بیٹھے کی لڑائی ہو جاتی تھی۔

مظفر آباد میں ایلی نے مسلسل طور پر کوشش کی کہ جھگڑا نہ ہوا۔ اس لیے وہ بڑے صبر و تحمل سے کام لیتا رہا۔ علی احمد ایلی کی اس خصوصیت سے واقف تھے اور اکثر جان بو جھ کر ایسی باتیں کیا کرتے تھے کہ جنہیں سن کروہ اکتا جائے اور جھگڑا کر اٹھ بیٹھے تا کہ انہیں بات سے مخلصی حاصل ہو جائے لیکن ایسے حالات علی احمد ایسے وقت پیدا کرتے تھے جب انہیں بات کی نوعیت کا علم ہوتا اور بات کے متعلق کچھ کرنے کا ان کا اپنا ارادہ نہ ہوتا اس طرح بات کے لٹوٹنے کی تمام تر ذمہ داری ایلی پر عائد ہو جاتی اور علی احمد پر کوئی حرفا نہ آتا۔

ان دنوں مظفر آباد میں بھی وہ اسی بات سے ڈرتا تھا اسی وجہ سے اس نے ہاجردہ کو بار بار تاکید کی تھی کہ راجو یا شیم سے بات نہ کرے کیونکہ اکثر مرتبہ ایسے حالات میں

وہ راجو اور شیم کو کہا کرتے بھی کیا معاملہ ہے کچھ پتہ تو لگا ویسے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ اور بات کی نوعیت سمجھ کرو وہ یوں ظاہر کرتے جیسے انہیں کچھ علم ہی نہ ہو اور پھر معاملے کی نوعیت کے مبارق عمل کرتے۔ بہر حال نویں روز بعد مشکل بات شروع ہوئی۔

حق والنصاف

”ہوں۔“ علی احمد بولے ”تو ایلی شادی کرنا چاہتا ہے۔“ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔ بی اے کر چکا ہے۔ دال روٹی کھاسکتا ہے۔ لہذا ضرور کرنی چاہیے اسے شادی۔ اور ایلی کی ماں سنا تھا تم نے تو ایلی کی منگشی کر کر گئی تھی۔ وہ کیا ہوئی۔ بھی ہم نے تو سنا تھا۔ شاید غلط ہو لیکن سنا ضرور تھا اچھا تو کیا تھا۔ انہوں نے ہاجرہ کے اشیاء میں سر ہلانے کے بعد کہا۔ ”بہر صورت بہت اچھا کی تھا تم نے۔ اور اگر تم اب شادی کرنا چاہتی ہو ایلی کی تو ضرور کرو۔ فوراً کرو۔“ میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھی جیسے میرا بیٹا ہے ویسے ہی تمہارا بیٹا ہے میں شادی کروں یا تم کرو باب کرے یا ماں کرے کیا فرق پڑتا ہے۔ تو اتنی سی بات کے لیے تم دونوں اتنا المباشر کر کے آئے ہو کیا۔ میں سمجھانے جانے کیا ہوا ہے۔ آسمان ٹوٹ پڑا ہے یا زمین ڈوب گئی ہے حد ہو گئی۔ ہی ہی ہی کیوں راجو۔“

”نہیں نہیں۔“ ہاجرہ بولی ”ایلی وہاں شادی کرنا نہیں چاہتا۔“

”وہاں نہیں کرنا چاہتا۔ کیوں؟“ کچھ دریک وہ ایلی طرف دیکھتے رہے پھر خود بولے۔ خیر خیر خیر یہ تو اپنی طبیعت کی بات ہے لیکن اس سے نہیں تو کسی اور سے ہی محلے میں اتنی ساری لڑکیاں ہیں آخر ان کا کرنا کیا ہے اچارڈا النا ہے کیا۔ وقت پر کام نہ آئیں تو فائدہ کیا ہوا ہی ہی کیوں راجو۔ ہے ناٹھیک بات۔“

”آپ مجھے کیوں درمیان میں گھیٹ لیتے ہیں۔“ راجو غصے میں بولی۔

”لو۔“ وہ مسکراتے۔ ”خواہ مخواہ بگزر ہی ہے بھی تو میری بیوی جو ہوئی۔“

”وہ بھی تو بیوی ہی ہے نا۔“ راجو نے شیم کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں ہاں بالکل ہے بے شک وہ بھی بیوی ہے۔ لیکن درمیان میں گھٹئے والی نہیں وہ صرف تم ہو ہی ہی ہی۔“ وہ بنتے۔

راجو کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ ”ہاں بھی تو میں کہہ رہا تھا ایلی کی ماں اتنی لڑکیاں جو پڑی ہیں محلے میں کسی ایک کو پکڑ لو اور یہ کار خیر سر انعام دے دو! اللہ اللہ خیر سلامیں بھی اطلاع کرو دینا۔ ایسا نہ کرنا جیسے ملکنی پر کیا تھا ہمیں خبر ہی نہ ہبھی۔ اور ہمیں اطلاع کرو گی ایلی کی ماں تو اگر پچھلی ملی تو انشاء اللہ ضرور پہنچوں گا اور ان دونوں کو تو چاہے آج ہی لے جاؤ؟“ انہوں نے راجو اور شیم کی طرف اشارہ کیا۔

”اے ہے،“ راجو بولی۔ ”محلے میں کوئی لڑکی ہے کام کی۔“

”لو،“ علی احمد بولے۔ ”یہ بھتی ہے بس یہی ایک کام کی تھی اور اس کے چلنے کے بعد دولت پور میں کوئی کام کی لڑکی باقی نہیں رہی۔“

”آپ میری بات نہ کیا کریں۔“ راجو غصے میں بولی۔

”اچھا،“ علی احمد بولے۔ ”صوچ لو۔ شیم بھی یہی کہا کرتی تھی۔ اور میں نے شیم کی بات مان لی تو اب خود ہی نا راض بیٹھی ہے۔ کہتی ہے مجھ سے بات نہیں کرتے۔“

”بس میرے زخموں پر نمک نچھڑ کے کوئی۔“ شیم بولی۔

”اے ہے آپ خواہ خواہ دوسرا بات چھیڑ بیٹھے۔“ راجو نے کہا ”یہ ایلی کی بات تو ختم کرو۔ میں کہتی ہوں محلے میں کوئی کام کی لڑکی ہو بھی۔“

”اوہو۔“ علی احمد بولے۔ ”بابا سب کام کی ہوتیں ہیں۔ چاہے ناک اوپنجی ہو یا بیٹھی ہوئی رنگ گندمی ہو یا سانو لا۔ آنکھ موٹی ہو یا چھوٹی۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”ہوں فرق نہیں پڑتا۔“ شیم چلائی۔ ”فرق نہیں پڑتا تو خدا تعالیٰ شادیاں کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”ہا گئیں۔“ وہ ایک ساعت کے لیے رکے۔ پھر ہنسنے لگے ”بھتی اتنی شادیاں نہ کر

تاتو اس نکتہ کا پتہ کیسے چلتا۔ اتنی شادیاں کرنے کے بعد تو یہ تجربہ ہوا۔ اسی ہی ہی۔

”ایلی کو تو اس بات کا تجربہ نہیں جھبھی اسے بتا رہا ہوں۔ ہی ہی ہی ہی ہی“
”لیکن۔“ ہاجرہ بولی۔ ”ایلی محلے میں کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔“

”ہائیں۔“ فتحا علی احمد خاموش ہو گئے۔ محلے میں نہیں کرے گا تو باہر اسے کون لڑکی دے گا۔“

”کیوں اسے کیا ہے۔“ راجب بولی۔

”بھی آخر بایہر والے کسی بات پر لڑکی دیتے ہیں۔ یا دولت ہو یا عہدہ ہو یا پھر خیر خیر نہیں۔ دولت ہے نہ عہدہ۔“

”وہ تو دینے کو تیار ہیں۔“ ہاجرہ نے بات کاڑا لے ہوئے کہا۔

”وہ۔“ علی احمد بولے ”کون ہیں وہ؟“

”بڑے اوپنچ کھاتے پیتے ہیں باعزت خاندان سے ہیں۔ باپ ریاست میں وزیر ہے بھائی بڑے عہدوں پر فائز ہیں لڑکی کو ہم دیکھ آئے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔“

”اوہ۔“ علی احمد بھونچکے رہ گئے۔

”بس آپ کی رضامندی اور صراشیر باد کی ضرورت ہے۔“ ایلی بولا۔

”ہوں۔“ علی احمد فتحا سنجیدہ ہو گئے۔ ”تو یہ بات ہے۔“

”آپ کے شامل ہوئے بغیر۔“ ایلی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”ویکھ نہ ایلی کی ماں۔“ علی احمد نہایت سنجیدگی سے بولے۔ ”ایلی کی شادی کا برہ راست دو پارٹیوں سے تعلق ہے۔ ایک تو ایلی خود ہے جس نے شادی کرنی ہے اور دوسرے ہم سب تم ایلی کی ماں۔ راجو شیم اور میں جنہوں نے لڑکی کے ساتھ رہنا ہے تو ایلی کی شادی دونوں پارٹیوں کے باہمی مشورے سے ہوئی چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”کیوں راجویہ بات حق و انصاف کی ہے یا نہیں۔“

”ہاں ہے تو مناسب“ راجونے جواب دیا۔

”تو اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے۔“ علی احمد نے کہا ”یا تو ہم لڑکی کا چناؤ کریں اور ایلی اسے پسند کرے اور یا یہ ایلی چناؤ کرے اور ہم اسے پسند کریں۔ کیوں راجو۔
ہےنا حق و انصاف کی بات۔“

”اورا گرائپ چناؤ ہی نہ کریں تو _____“ راجبوولی۔

”بھی ہمیں موقع دوتاں آج بات کی ہے ایلی کی ماں نے ہمیں چھ مہینے کی مہلت دی جائے چھ مہینے میں ہم لڑکی کا چناؤ کریں گے لاسے آزمائیں گے۔“

”اورا گروہ ایلی کو پسند نہ کرنے تو،“ شیم نے کہا۔

”تو پھر موقعہ دیا جائے تاکہ کوئی اور پسند کریں۔ انصاف کی بات ہے۔“

”بس آپ پسند کرتے رہیں _____ حتیٰ کہ ایلی بوڑھا ہو جائے۔“ راجبوولی۔ ”اچھا تو ایک اور صورت ہے۔“ علی احمد بوالے ”ایلی ہمیں چار یا پانچ لڑکیوں کے نام دے دے جن سے وہ شادی کرنے کے لیے تیار ہے ان میں سے ہم ایک چلن لیں گے۔“

”ایلی ہنسنے لگا چار پانچ نام“ _____ وہ بولا۔ ”آپ بھی کمال کرتے ہیں،“

”اچھی لڑکی تو بڑی چکل سے ملتی ہے۔“ راجبوولی۔

”یہ ایک لڑکی ہے جو بڑی مشکل سے تلاش کی ہے۔“ ہاجرہ نے کہا۔ ”ایسی لڑکیاں کہاں ملتی ہے آج کل۔“

”علی احمد خاموش ہو گئے۔“

”آپ جواب کیوں نہیں دیتے۔“ راجونے کہا۔

”ہاں“ ہاجرہ بولی ”یہ رشتہ جو ہم نے چنان ہے۔“

”یہ رشتہ _____ علی احمد رک گئے۔“

”ہاں ہاں یہ رشته“ ہاجرہ نے دہرایا۔

”اس سے اچھار شنہ نہیں ملے گا۔“ راجو بولی۔

”جو کچھ بتایا ہے ایلی کی ماں نے اس کی مطابق تو یہ اچھار شنہ ہے۔“ شیم نے کہا۔

”بات کیجئے“ راجو علی احمد کو خاموش دیکھ کر غصے میں چینے لگی۔

”یہ رشته مجھے پسند نہیں“ علی احمد بولے۔

ایلی کا دل ڈوب گیا۔

”لیکن وجہ؟“ ہاجرہ غصے میں بولی۔

”وہ بہت اونچے لوگ ہیں۔“ علی احمد نے سمجھ دی گئی کہا۔

”یہ تو الٹا اچھا ہے۔“ راجو دبی زبان سے بولی۔

”میں بہت چھوٹا شخص ہوں۔“ علی احمد کہنے لگے اور میں اعلیٰ اور اونچے خاندانوں سے رشته نہیں کروں گا۔ میں تو اپنے بچوں کا وہاں رشته کروں گا جہاں میری ایک حیثیت ہو جہاں میری بات کو انہم سمجھا جائے جہاں میری عزت ہو۔
جہاں

”اے ہے وہ تو یہی عزت کرنے والے لوگ ہیں۔“ ہاجرہ بولی۔

”نہیں یہاں نہیں ہوگا۔“ علی احمد کہا۔ ”اگر میری رضامندی کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے تو یہاں نہیں ہوگا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ بیٹھے اور اپنی ڈسک پر بیٹھ کر حساب کے رجستر میں لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

مظفر آباد سے واپسی پر ایلی کے سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی کھڑا تھا اور پانی کے اس پھیلاو میں گاڑ ہونک رہی تھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ پھیلا ہوا [انی علی احمد کا انکار تھا۔ انکار رہی انکار اور اس پر چاروں طرف اداں آسمان محیط و مسلط۔ گاڑی کراہ رہی تھی۔ ہوا شامیں شامیں کر رہی تھی۔ ہاجرہ گھنٹوں میں مردیے

بیٹھی تھی۔ ایلی کھڑی کی سے باہر گلکلی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔

”دور دور“ سادی یہ کہتے ہوئے بھاگی جا رہی تھی۔ ”نہیں میں وعدہ کرچکی ہوں اس معاملے میں میں مجبور ہوں۔ میں مجبور ہوں میں مجبور ہوں۔“

چاروں طرف ٹھہر اہوا پانی ابھر رہا تھا۔ پانی ہی پانی ہی پانی ہی پانی۔ آسمان پانی گر کر ڈوب چکا تھا۔ کہیں کہیں اس کے گلڑے گلڑے دکھائی دے رہے تھے۔

”فلاٹا باہر پیش نہ لگا۔“ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔“